[illegible]

زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ دار

دوشینہ شکستیم بیک توبہ دو صد جام
امروز بیک جام دو صد توبہ شکستیم

پیمانہ

زیرِ نظر

ساغر نظامی

مدیر
صہبا

ادبی مرکز میرٹھ

ساغر نظامی کا مکمل مجموعۂ نظم

بادۂ مشرق

قیمت صہ فی جلد سائز ۲۰×۲۶/۱۶ جلد آرٹ کا اعلیٰ نمونہ مضبوط و حسین، کاغذ بہترین ۳۶ پونڈ حجم ۱۴۴ صفحات

محترمہ جہاں آرا بیگم شاہنواز ایم، ایل، اے کی رائے

"ساغر نظامی ہمارے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو ہمیں مستقبل کا اُمید افزا پیغام دیتے ہیں ہمارا قومی ادب پستی اور یاس کی گہرائیوں میں گر چکا تھا، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان ادیب اسے امید و اتحاد کی بلندیوں کی طرف لئے جاتے ہیں، ہمارے ملک و قوم کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے ایسے شاعروں کا وجود ایک قومی کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ جو قوم کے افراد کو یگانگت، انسانی ہمدردی اور فطری توانائی کا سبق دیں۔ ساغر صاحب ایک ایسے شاعر ہیں۔ اِن کے پڑھنے کا انداز سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اِن کی نظمیں انھیں سے سُننی چاہئیں۔ سُننے والے پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا اثر مدت تک قائم رہتا ہے۔

میں نے فرصت کے اوقات میں اُن کا دیوان بادۂ مشرق پڑھا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ لاجواب کتاب پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔ اس کی ظاہری و معنوی خوبیاں یکساں ہیں۔ جا بجا خوبصورتی اور رنگینی نے ظاہری اور معنوی حیثیت نے ایک ادبی گلزار کی صورت پیدا کر دی ہے۔ بادۂ مشرق ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہونا چاہیے۔"

جہاں آرا شاہنواز از لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء

قیمت سالانہ محض

تعارف

تصویر :- حضرت اشرف امیر الامرا النواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ
رئیس اعظم حیدرآباد (دکن)

جلد ۱ | پیمانہ :- اگست سنہ ۱۹۳۷ء ادبی مرکز میرٹھ | نمبر ۲

میخانۂ ادب میں پیمانہ کا خیر مقدم

ہفتہ وار تیج دہلی
۱۳ جولائی ۱۹۳۷ء

بہت دنوں کی بات نہیں کہ ہندوستان کا مشہور علمی و ادبی رسالہ "پیمانہ" شائع ہوا کرتا تھا۔ اکبرآباد میں اس نے اپنی زندگی کے چار دور گزارے اور اب اس کی اشاعت کا پانچواں دور میرٹھ سے جناب ساغر کی زیر نگرانی شروع ہوا ہے۔ اس کا پہلا پرچہ ہمارے پاس ریویو کے لئے آیا ہے۔ جو گوناگوں خوبیوں سے لبریز ہے، اور یقیناً زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ وار ہے۔ نثر کا پہلا مضمون "دکٹر ہوگیو" کے ایک شاہکار "محبت" کا ترجمہ ہے اور پہلی نظم "صبر کر" کے عنوان سے حضرت جوش ملیح آبادی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ باقی مضامین بھی بلند پایہ اور قابل داد ہیں۔ رسالہ کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ساغر کی نگرانی میں "پیمانہ" کا یہ پانچواں دور بھی بہت کامیاب ہوگا۔ یہ چند سطریں تعارف کے طور پر لکھدی گئی ہیں۔ مفصل ریویو ہم کسی آئندہ اشاعت میں درج کریں گے۔

جامِ صہبا

دیکھ کر مجھ کو مسکرا بھی دے — دولتِ دلبری لُٹا بھی دے
دردِ دل مجھ کو بخشنے والے — دردِ دل کی مجھے دوا بھی دے
غم دیا ہے تو او ستم پرور — فرصتِ دردآشنا بھی دے
رحم فرما مری نگاہوں پر — بجلیوں کا نقاب اُٹھا بھی دے
پار طوفاں سے ہو سفینہ ابھی — کچھ سہارا جو نا خدا بھی دے
طرحِ توحیدِ عاشقی فرما — درمیاں سے حجاب اٹھا بھی دے

گو نہیں ظرفِ عشق صہبا میں
جام ہلکا سا اک پلا بھی دے

"ایڈیٹر"

جرعات

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پیمانہ کے پہلے ہی دور نے ادبی دنیا میں زندگی کی نئی سرمستی پیدا کر دی اور میخانۂ ادب میں جس مسرّت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا وہ نہ صرف اس کے بادۂ ادب کے کیف آور ہونے کا ثبوت ہی بلکہ خمستانِ ادب اور بادہ کشانِ صناعت (آرٹ) کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی ہے۔

صحرا سے فضائے گلستاں تک مستی
ہے آج زمیں سے آسماں تک مستی
وہ جامِ خرد سوز دے اے جانِ حیات
چھا جائے مکاں سے لامکاں تک مستی

اور حقیقت یہ ہے کہ پہلا جام جس بیتابی اور بے صبری سے ڈھالا جاتا ہے کچھ اسی نوعیت سے پیمانہ کے پہلے نمبر کی ترتیب ہوئی۔ مگر یہ نمبر نتیجہ ہے قدرے سر درگا اسلئے میکشوں کے حسنِ طلب کے ظرف و ذوق کے لحاظ سے شراب زنگار رنگ سے لبریز ہے۔ یعنی گدائے میکدہ "کسیکیں" بہ فضلِ ساقی "ہر طرح" کی موجود ہے اور سیری کا یہ عالم ہے کہ

"جتنی پی لی ہے ابھی اتنی ہی پیمانے میں ہے"

ہر کام کے لئے ایک مناسب شبھ گھڑی ہوتی ہے سو میری ایماندار آنہ (بے ایمانی کا میخانہ میں امکان نہیں) اسلئے ہم کہ سنہ ۱۹۲۳ء پیمانہ کے آغاز کے لئے شبھ گھڑی نہ تھی یہ وہ موسم تھا کہ خود ساقی تناسب ہوش سے محروم اور پیمانہ کیف و کم سے عاری تھا۔

پینے پلانے کا موسم تو اب آیا ہے کہ "نشے سے ہے کل سوادِ اعظم بیخود" اور اس بیخودی میں خودی کا وہ جوش ہے کہ ہر لغزش بجائے خود اعتماد ہے۔ ساغر کی "خانہ کاری" پختہ کیفی کی ضامن ہے اور بیخودی اپنا آپ اہتمام ——— !

اللہ اللہ یہ میکدے کا نظام
مقتدی ہے کوئی نہ کوئی امام

اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر دَور اپنے دَورِ ماقبل سے کیف و مستی میں کسی طرح بھی کم ثابت ہوگا
بنام ساقی دورِ پیمانہ کا آغاز ہوا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ ہر پیمانہ کچھ ہی دنوں میں بجائے خود "میخانہ"
نہ بن جائے اور رندانِ بادہ خوار سرشار ہو کر چیخ نہ اٹھیں ؎

کب تک آخر جرعہ جرعہ قطرہ قطرہ ساقیا　　لا اُلٹ لیں آج پیمانہ میں کُل میخانہ ہم

لِلّٰہ الحمد، "یہ بزمِ میکدہ" کوئی کم خور، بادہ کشوں کی انجمن تو ہے نہیں یہاں تو جو ہے
"معیاری" ہے - ایک طرف جوشؔ و جگرؔ، اخترؔ و آزادؔ ہیں تو دوسری طرف اخترؔ و حفیظؔ، فطرتؔ اثرؔ ہیں
اِدھر بشیرؔ و یحییٰؔ ہیں تو اُدھر مخمورؔ و نیازؔ، نگہ اٹھائیے تو ساقی جام بدست ــــ نظر بچائیے تو بادہ کش
سچ پوچھیے تو امتیازِ "ساقی و مے کش" کہاں؟ ایک دوسرے کو اپنا ہوش ہیں،
میکدے کے سورج کا کیا ذکر، میخانے کے سوئے اور دبے ہوئے ذرّے پکار رہے ہیں

میرے حالات پر نہ جا ساقی　　ہاں پلا جام مے پلا ساقی
ارتقا گر ہے انتہائے زوال　　ہے تنزل بھی ارتقا ساقی

اس عالم سے جو دُور ہے اُس کو اپنی بدبختی کے "رجسٹرڈ ہونے" کا یقین کر لینا چاہیے.
اور جو منکر ہے وہ ــــــــــــــــــــــــــ!

ــــــ! سعادت کچھ اسی میں ہے کہ سرِ شام درِ میخانہ پر صدا دی جائے!

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

سنبھل

تاریخ کی لغزشیں

(سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

تاریخ جہاں ماضی کے تجربات سے حال پر اثر ڈالتی ہے اور مستقبل کے لئے بہتری کا سامان فراہم کرتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس کے مغالطے قوموں میں تصادم و نفرت کے محرک بھی بن جاتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ دنیا "تاریخ کے صفحات میں ضمیر انسانی کے نشو و ارتقا اور مدارج آزادی کو تلاش کرنے کے بجائے قومی عظمت و برتری کے افسانوں کو ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ مورخ کا قلم پیدائشی ماحول اور عقائد و نیز قومی سیاسیات کی مصلحتوں سے مبرا ہو کر حقیقت نگاری اور صحیح تحقیق کا توازن بہت کم قائم رکھ سکا ہے۔ اور اگر آج ہم انسانی برادری کے صدہا تنازعات کے اسباب کی چھان بین کرنے بیٹھ جائیں تو کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے جو مصلحت طراز دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ثابت ہوں گے اور حقیقت سے انھیں دور کا بھی تعلق نہ ہوگا۔ علم الاجتماع کے بانیٔ اوّل علامہ ابن خلدون نے اس ناجائز آمیزش کو دور کرنے کے لئے مجبوراً یہ قاعدہ مرتب کیا کہ جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا، اتنی ہی زیادہ افسانہ سرائی اسے اپنے حصار تخیّل میں لے لیگی۔ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس رمز کو زیادہ لطیف

پیرایہ میں اس طرح ادا کرتا ہے کہ "انسانی عظمت کی انتہا یہ ہے کہ افسانہ بن جائے"۔
ہندوستان کی تاریخ اس قسم کے تاریخی شعبدوں سے بھری پڑی ہے اور اگر آج محتاط تاریخی شہادتوں کو جمع کیا جائے تو شاید ایسی تاریخ پیدا ہو جس کی روشنی میں وہ بہت سے تنازعات خود بخود نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی سرزمین متضاد جذبات میں تقسیم ہو چکی ہے، ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور چونکہ طلبا میں تحقیق کا مادّہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کی تعلیم کا اصل منشا صرف چند درسی کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ حقیقت سے بیخبر رہتے ہیں اور غلط معلومات کے زہریلے جراثیم لے کر جب وہ میدانِ عمل میں آتے ہیں تو باہمی اختلاف کی خلیج کو وسیع تر کرنے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے۔
اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جب ہندوستانی طالب علم تاریخ کے مطالعہ میں مصروف ہوتا ہے تو بصیرت اور صحیح قوتِ فیصلہ اس کی رہنمائی نہیں کرتے، عقائد ذاتی کے دبیز حجابات اس کی دماغی اور تنقیدی قوتوں کو بیدار ہونے سے روکتے ہیں، قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے وقت ایک مسلمان طالب علم کا زاویۂ نگاہ تلاش حق سے اتنا ہی دور ہوتا ہے جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی، وہ پراچین تہذیب میں بت گری اور اصنام پرستی کے سوا کوئی چیز نہیں دیکھتا، اس کی متعصب نگاہ ان خوبیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے جو ہندوستان کے شاندار ماضی میں پنہاں ہیں، وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ جب کرۂ ارض کا بڑا حصہ درختوں کے پتّوں یا جانوروں کی کھالوں سے اپنی عریانی کو ڈھانپتا تھا اُس وقت ہندوستان تمدن کی کتنی بلندی پر پہونچ چکا تھا، اگر قدیم ہندوستان پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہاں آپ کو ہر قسم کی چیز نظر آئے گی، جمہوریتیں، بادشاہتیں، شاہنشاہیاں، فلسفے، الٰہیات، یوگ، سیاسیات، نظامِ حکومت، سائنس، فنون، مذہب، شعر و سخن، ہر قسم کی یادگاریں، محلات، منادر، عالیشان عمارتیں، سوسائٹیاں، روحانی علوم، دنیاوی قوانین، ضابطے، رسم و رواج، تجارتیں، صنعتیں غرضکہ ایک لامتناہی فہرست ہے۔ اور ہر شعبہ میں سرگرمی عمل فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے اس دَور میں آپ دیکھیں گے کہ یہ ملک ہر چیز پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی قوتِ تخلیق نہیں

تھکتی۔ ایک پل کے لئے دم نہیں لیتا اور نہ بیکار ہوکر بیٹھتا ہے اس کی وسعت جغرافیائی حدود کو چیر کر دوسرے ملکوں تک پھیل جاتی ہے اِس کے جہاز سمندروں کو عبور کرتے ہیں اور اس کی دولت کی فراوانی مصر اور روم کے ساحلوں سے ٹکرا کر ان کے خزانوں کو معمور کرتی ہے۔ اس کی نوآبادیاں مشرق الجزائر میں قائم ہوتی ہیں اور اپنے فنون اور منظومات رزمیہ سے انھیں مالامال کردیتی ہیں۔ اس کا مذہب چین اور جاپان کو فتح کرلیتا ہے، اپنشدوں کے اصول اور بدھ مت کی تعلیمات کی بازگشت مسیح کے ہونٹوں سے سنائی دیتی ہے، ہر جگہ کیا زراعت اور کیا علوم وفنون، زندگی کی قوت نظر آتی ہے۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھئے کیا مسلم طالب علم ان تمام حقائق کو دیکھتا اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے؟

ٹھیک اسی طرح ایک ہندو طالب علم کی بے بصری بھی کچھ کم اندوہناک نہیں، آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر جبکہ محمد ابن قاسم نے سندھ کے ریگستانوں پر یورش کی تھی، ۱۸۵۷ء کے غدر تک اس حقیقت فراموش طالب علم کو اسلامی مظالم اور استبداد کے سوا اس ایک ہزار سال کی تاریخ میں اور کوئی داستان نہیں ملتی وہ صرف جنگ و جدل اور اسلامی فتوحات کی خونچکاں داستان کو دہراتا رہتا ہے اور صرف یہی ایک کہانی اس کے حافظے کے لئے مخصوص ہوچکی ہے۔ اسلامی کلچر اور تمدن نے ہندوستان کو جن نئی چیزوں سے روشناس کیا اور اتحاد تہذیب سے جس نئے کلچر کی تخلیق ہوئی اس سے وہ یکسر غافل اور بے خبر ہی نہیں بلکہ اس کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی اس کے دماغ اور دل میں گنجائش تک نہیں، کتنے ہندو طلبا اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ اورنگ زیب جس کے نام سے ان کی پیشانی سمٹ جاتی ہے اور جس کے تعصب اور تنگدلی کی داستان ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر چکی ہے اتنا ہیبتناک نہ تھا جس قدر عام مورخین نے اس کا خوفناک خاکہ پیش کیا ہے۔ انگریز مورخ الفنسٹن لکھتا ہے۔

"کسی جگہ اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ مذہب کی وجہ سے کسی ایک بھی ہندو کو سزائے موت یا قید سے دوچار ہونا پڑا ہو یا اس کے مال و زر پر محصول عائد کیا گیا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانہ میں کسی ایک فرد کو بھی اپنے باپ دادا کے طریقے کے مطابق علانیہ عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہو۔"

اور مسلم بادشاہ شیر شاہ سوری کے متعلق ایک یورپین مورخ کی تحقیقات ہے کہ "شیر شاہ

ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنت ہند کو رضائے عوام کے مطابق قائم کیا۔ کسی حکومت نے حتیٰ کہ حکومت برطانیہ نے بھی اتنی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا جتنا کہ اس پٹھان نے "

سر پی، سی، رے جن کی تاریخی حیثیت بہت بلند ہے، قوی شہادتوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ " ہندوستان میں ترقی اسلام کی تاریخ، ہندو مسلم آمیزش کی تاریخ ہے"۔۔۔

ہندو مسلم اتحاد، ان دو بڑی نسلوں کے خیالات، جذبات اور روایات کا ارتباط صرف سیاست تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ معاشرتی تعمیر کے اندرونی گوشوں تک پہونچ گیا تھا جس کا نتیجہ وہ تحریکات ہیں جو معاشرتی اور مذہبی رنگ میں رونما ہوئیں ۔۔۔۔ گرونانک کبیر اور چیتنیہ ان دونوں کلچروں کی آمیزش کا ہی ثمر ہیں ۔۔۔۔ اسلام کی جمہوری اسپرٹ نے ذات پات کے قدیم تیبیج سسٹم کو توڑنے اور خود ہندو سماج میں روا داری اور بلند خیالی کی روح پھونکنے میں بڑا نمایاں اثر ڈالا ہے۔ علوم وفنون کے سلسلے میں زیادہ کہنا بیکار ہے۔ یونانی دماغ کا جوہر گراں مایہ انھیں مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ہندوستان میں پہونچا۔ فتحپور سیکری اور تاج کا معمار انصافاً خونخوار بھیڑئے کے نام سے پکارے جانے کا ہرگز مستحق نہیں ہو سکتا۔ فنون لطیفہ کی کوئی بھی ایک شاخ ایسی نہیں ملے گی جو اسلامی حکمرانوں کی ممنون احسان نہو۔ بلکہ صدہا تاریخی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رائج الوقت تاریخ نے ہندوستان کی صحیح تاریخ پیش کرنے میں مجرمانہ کوتاہی کی ہے۔ یہ چونکہ ایک مختصر مقالہ ہے اس لئے شرح وبسط کے ساتھ اس موضوع پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

ماحصل یہ ہے کہ ہندوستانی طالب علم آزاد دماغی سرگرمی سے بے بہرہ ہے۔ مرتب اور نقاد دماغ اور شعور تحقیق پر غنودگی طاری ہوگئی ہے۔ ذہنی ارتقاء، مشاہدہ اور تحقیق کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی کی مسرتیں بھی ختم ہوگئیں اور بعض ایسے فتنے کھڑے ہوگئے ہیں جو اجتماعی زندگی کے لئے سم قاتل ہیں، اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دماغی اور تنقیدی قوت بیدار ہو، خیالات میں اتنی آزادی اور لچک پیدا ہو جائے کہ مذہبی رجعت پسندی یا نسلی تعصب تلاش حق اور تفہیم حق میں سدراہ نہو سکیں، جس قوم کے طلباء حق و باطل میں امتیاز کرنے کے خوگر نہ ہوں وہ کبھی اپنی پوری بلندی کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی۔ غلط تاریخ ہماری

تمام نامرادیوں کا سرچشمہ ہے لیکن صحیح تاریخ اِن نامرادیوں کو دور کر سکتی ہے۔ ہماری موجودہ علمی زندگی محض ادبی اور جذباتی ہے۔ گہری نہیں،
ہمیں ایک ایسی نئی زندگی کی ضرورت ہے جو سوشل خیالات میں وسعت پیدا کرے اور قوم کو اس تمدّن سے آشنا کرے جو گہرا اور حقائق پر مبنی ہو۔

آس کی چنگاری

اُٹھا یہ کون ساغر و مینا لیے ہوئے — مستانہ لغزشوں کا سہارا لیے ہوئے
نکلے ہیں تیری بزم سے ہم کیا لیے ہوئے — (ق) احساسِ صد شکستِ تمنّا لیے ہوئے
سینے میں ایک کشمکشِ مرگ و زندگی — دل میں توہمات کی دنیا لیے ہوئے
اک دوش پر لیے ہوئے تابوتِ آرزو — اک دوش پر وفا کا جنازا لیے ہوئے
الزام کیوں ہے چشم تماشائے شوق پر — جلوے ہیں خود پیامِ تمنّا لیے ہوئے
آخر جنوں کا بھید ستاروں پہ کھُل گیا — ذرّے چمک اُٹھے غمِ صحرا لیے ہوئے
اب نازِ عاشقی کو ہے اُس دن کا انتظار — وہ آئیں میرے در پہ تمنا لیے ہوئے
پھر دل ہے اور بہار میں لٹنے کی آرزو — نوخیز بال و پر ہیں تقاضا لیے ہوئے
حدِّ تعیّنات سے کوسوں نکل گئے — میں اُن کا اور وہ مرا سہارا لیے ہوئے

ساغر حدودِ عشرت و غم سے گزر گیا
ساقی کی اک نظر کا سہارا لیے ہوئے

ساغر نظامی
۱۹۳۷ء

چمپا

(رومانی وجودیت کی آئینہ دار، ہندوستانی زبان کی ایک نظم)

مجھے دن رات مصروفِ عمل پاتی ہوئے چمپا
تو تم یہ دیکھ کر سکتہ میں رہ جاتی ہوئے چمپا
کہ شاید میں تمھیں اس غم میں دل ہی سے بھلا بیٹھا
عروسِ مادی کے گیسوؤں میں دل پھنسا بیٹھا
مگر یہ جہد مضراب ربابِ کامیابی ہے
عمل دیباچۂ بابِ کتابِ کامیابی ہے ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مصروف ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بیچین ہوں چمپا!

———?

مری چمپا میں کیوں بیچین اور بیتاب رہتا ہوں
میں کیوں مضطر مثالِ پیکرِ سیماب رہتا ہوں
میں شعلہ سا بھڑکتا ہوں خیالوں ہی خیالوں میں
ہر اک شے پر تڑپتا ہوں خیالوں ہی خیالوں میں
مسلسل حملۂ رنج والم کیوں ہے مری چمپا!
بہارِ زندگی یوں نذرِ غم کیوں ہے مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بےچین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگین ہوں چمپا!

———?

یہ تاروں کے کٹوروں میں شرابِ نور اے چمپا

یہ پیپل کے درختوں پر شبابِ نور اے چمپا!
شبابِ نور سے ہر گام پر اک طور اے چمپا!
یہ خاموشی یہ موسیقی قریب و دور اے چمپا!
مگر تو اس بہشتِ زندگی سے دور ہے چمپا!
طلسمِ مذہب و اخلاق میں محصور ہے چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغرور ہوں چمپا!
——— ؟

تبسم نے ترے تاجِ حیاتِ جاوداں بخشا
مری ہستیٔ فانی کو ثباتِ جاوداں بخشا
زباں بخشی بیاں بخشا نظر بخشی اثر بخشا
مرقص روح بخشی اور قلب نغمہ گر بخشا
ذرا اٹھلا کے جمنا پر خراماں ہو مری چمپا!
کنول کی پنکھڑی پر آج رقصاں ہو مری چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغرور ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدمست ہوں چمپا!
——— ؟

وہ تیرے کندنی ماتھے پہ رنگیں چاند سا ٹیکا،
جڑا ہو آئینے میں جس طرح یاقوت کا ٹکڑا،
وہ رنگیں چوڑیوں کے گیت وہ باہوں کا دوتارا
وہ مے نوشی وہ دل کی دھڑکنیں وہ مست سناٹا
وہ ساون کی جھڑی وہ جھینگروں کے راگ اے چمپا
مرے سینے پہ لہراتے ہوئے دو ناگ اے چمپا! ——— مری چمپا

تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدست ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا!

؟

مری چپ ایک گہرا راز ہے اسرارِ الفت کا
زباں سے کچھ نہیں کہتا تو گویا کچھ نہیں کہتا
میں چپ ہوں اور چپ رہنا محبت کی شرافت ہے
خموشی مذہبِ الفت میں عاشق کی عبادت ہے،
مری چپ بربطِ خاموش الفت ہے مری چمپا
یہ بربطِ زمینتِ آغوشِ قدرت ہے مری چمپا! —— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا

؟

جو میں بولا تو ایوانِ مذاہب گونج اُٹھے گا،
لرز جائے گا کعبہ کانپ اُٹھے گی دیر کی دنیا
چھڑے گا اک مہیب انداز سے ناقوس کا نغما
اُٹھے گا شور بحر و بر سے اک اللہ اکبر کا
مری یہ مستقل چپ ایک گہرا راز ہے چمپا!
خموشی جذبۂ خاموش کی آواز ہے چمپا! —— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں چمپا!

؟

یہ مذہب ہے جو دل کے ساغروں کو چور کرتا ہے
یہ مذہب ہے جو ہر نزدیک شے کو دور کرتا ہے
تجھے غمگین کرتا ہے مجھے رنجور کرتا ہے

ہماری روح کو ہر گام پر مجبور کرتا ہے
مری صابر محبت میرا مذہب ہے مری چمپا!
یہی رنگیں حقیقت میرا مذہب ہے مری چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مجبور ہوں چمپا!

———؟

اگر بے صبر ہو جاؤں، اگر آزاد ہو جاؤں
تو قلعے مذہب و اخلاق کے اک آن میں ڈھاؤں
زمینوں کو ہلا دوں اور پھینکوں آسمانوں پہ
اُٹھا لوں جوش میں ترلوک کو کمزور شانوں پہ
مگر تیرا خیال آ کے مجھ کو روک دیتا ہے
بہکتا ہوں تو استادِ محبت ٹوک دیتا ہے ——— مری چمپا!

"؟"

خدائے حسن کو دعا مانگتے دیکھ کر!

اس طرح وہ خاموش دعا مانگ رہے ہیں
گویا کوئی گم کردہ ادا مانگ رہے ہیں
خود خالقِ صد حسن و ادا ہو کے وہ مخزولؔ
اللہ سے کیا جانیئے کیا مانگ رہے ہیں

اصغر مخزول

دیوانگی

یہ واقعہ ہے کہ خواہ دنیا بھر کے ڈاکٹر اور حکیم اِس چیز کو ایک خوفناک بیماری کہتے کہتے اِسی میں مبتلا ہو جائیں لیکن میں اور میرے ہم وطن شعراء اِسے ایک عطیۂ قدرت ہی سمجھتے رہیں گے۔ یقین نہ آئے تو ہم میں سے کسی ایک کی غزل اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔ کوئی مجنوں کی دیوانگی پر رشک کر رہا ہوگا اور کوئی فرہاد کی وحشت پر فخر، کوئی اپنے آپ کو دیوانہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہوگا اور کوئی خللِ دماغ کی ایک ایک علامت اپنے اندر گنا کر رکھ دیگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم لوگ بجائے آگرہ اور بریلی کے مخصوص مہمان خانوں کے بازاروں میں چلتے پھرتے، دفتروں میں کام کرتے، اور مشاعروں میں عجیب عجیب سُر نکالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اِس بات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس عطیۂ قدرت کی مختلف قسمیں اور درجات ہیں۔ اگر انھیں گاؤدُم طریقہ پر لکھا جائے تو ترتیب یہ قرار پائے گی۔

بیوقوفی، حماقت، چُغدپن، خبط، مراق، سنک، پاگل پن، وحشت اور جنون۔ آیئے اِن کی ماہیت پر علیحدہ علیحدہ غور کریں۔

بیوقوفی:۔ یہ چیز بہت عام ہے اور ذرا سی غلطی پر خواہ وہ ٹنکچر آیوڈین اور جوارش جالینوس کے صحیح ہجے بھی نہ جانتا ہو فوراً دوسرے کے لئے تشخیص کر دیتا ہے۔

حماقت:۔ بیوقوفی کی بڑی بہن ہے اور اس سے ایک بڑی حد تک مشابہ، فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ بے وقوفی کا اُس ہستی پر اطلاق ہوتا ہے جس میں عقل کی کمی ہو اور حماقت کا اُس پر جس میں عقل تو ہو لیکن کسی قدر معطل،

چُغدپن:۔ بھی اِن دونوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئیے کہ اگر حماقت میں تھوڑا سا سیدھا پن اور شامل کر دیا جائے تو وہ چُغدپن ہو جائے گا۔ جس شخص کو خوش قسمتی سے چُغدپن حاصل ہو جائے وہ جانوروں سے زیادہ مشابہ

ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُس کے سر پر سینگ دکھائی دینے لگتے ہیں یا پیروں میں پانچ اُنگلیوں کی جگہ ایک سُم، بلکہ اُس کی سیرت انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے ملنے لگتی ہے اور آپ اُس کی ہر حرکت پر چھوٹتے ہی کہہ دیتے ہیں۔ "اُلّو - گدھا۔ مہربانی فرما کر اِس پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہ کیجیے کہ آخر کسی چغد قسم کے انسان کو اُلّو یا گدھا ہی کیوں کہا جاتا ہے۔ بلّی کیوں نہیں کہہ دیتے۔ کبوتر فرما دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ حالانکہ اُلّو اور گدھا دونوں صاحبان اپنی فیلسوفیت اور عقل و دانش کے لحاظ سے سب جانوروں میں برتر تسلیم کرلئے گئے ہیں، یہ گتھی بہت پیچیدہ ہے اور عرصۂ دراز سے یونہی چلی آتی ہے۔ جناب اُلّو کو تو جنیا بیگم کے عشاق کی طرح دن بھر اونگھنے یا سونے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ سُنا گیا ہے کہ ایک دفعہ گدھے صاحب کو حضرت انسان کے اس چغد پن پر نہایت سخت قسم کا غصّہ آگیا۔ جس کے ثبوت میں آپ نے ایک دُبلے پتلے انسان کے جو انھیں آسانی سے قریب ہی مہیّا ہوگیا تھا پوری طاقت سے ایک دولتّی رسید کردی۔ اب بتائیے کہ وہ آدمی کا بچّہ جو اپنی مادر محترمہ یا شفیق اُستاد کے ایک دو ہنٹر کی تاب نہ لاسکتا ہو، جناب کی دولتّی نوش کرکے کتنا ناچا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس غریب کو فوراً ہسپتال بھیجا گیا اور آپ کو غالباً "کانجی ہوز" وہاں کسی چغد کو جو چغد پن سوجھا تو آپ کا بیان لے ڈالا۔ آپ نے نہایت اطمینان سے گلا صاف کرکے خاص بیرسٹرانہ انداز میں فرمایا کہ "ہمارے نازک نازک کان انسان کے اس چغد پن سے پک گئے کہ وہ جب اپنے کسی ہم جنس کی حماقت کا علانیہ اظہار کرنا چاہتا ہے تو اُسے "گدھا" کہہ دیتا ہے اور جب ہم سے زیادہ ضبط نہ ہوسکا تو ہم نے محض بطور احتجاج اس آدمی کے ایک ہلکی سی لات ماردی تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت انسان کو اس چغد پن سے روکنے کے کام آوے اور چونکہ یہ واقعہ محض ایک اشتعال کا نتیجہ ہے اسلئے بموجب دفعہ فلاں قانون فوجداری گورنمنٹ ہند ہم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا"، لیجیے چھٹی ہوئی۔ اب یہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ انھیں اس جرم میں کیا سزا بھگتنی پڑی۔ البتہ قیافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسان نے لاجواب ہوکر انھیں نہایت عزت و آبرو کے ساتھ بری کردیا۔

خبط:- چغدپن سے ایک درجہ اور ترقی کی جائے تو خبط کی حدود شروع ہوجاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس درجۂ عالیہ پر فائز ہوتے ہی انسان کو کسی خاص شئے سے زیادہ لگاؤ ہوجاتا ہے اور تشخیص کرنے والے فوراً کہہ دیتے ہیں "خبطی ہو گیا ہے،" خبط ہر شے کا ہوسکتا ہے۔ گھوڑ دوڑ کا خبط، ٹکٹ جمع کرنے کا خبط، اور زیادہ اونچے پہونچے تو مضمون نگاری کا خبط، اور نوالی کی ترنگ میں آئے تو مقدمہ بازی کا خبط، خبطی ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی محبوب شے کو دنیا بھر میں انتخاب کرلیتا ہو بلکہ اُس کے مقابلے میں وہ دنیا کی تمام چیزوں کو خواہ وہ اُس سے کتنی ہی بہتر اور سودمند کیوں نہ ہوں لچر قرار دے دیتا ہے۔ کسی گھوڑ دوڑ کے خبطی کے سامنے آپ کوئی عمدہ سے عمدہ مضمون پڑھنے لگئے اُس پر فوراً دیوانگی کا دورہ پڑجائے گا اور وہ اپنے خبط کے ثبوت میں آپ کے ہاتھ سے مسودہ چھین کر بھاگنے سے بھی دریغ نہ کرے گا یا کسی پرانی تہذیب کے بزرگ کے سامنے موجودہ سُرالاپنے لگئے تو فوراً لاحول پڑھ کر آپ کے اس طرح پیچھے پڑجائیں گے۔ گویا آپ جیسے شیطان نما انسان سے بدلالینا اُن کا مذہبی، اخلاقی اور تمدنی فرض ہے اکبر الہ آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ پڑھ کے بچّے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مراق:- آپ سے تعارف کیجئے۔ آپ بھی ایک عطیۂ قدرت ہیں اور خبط صاحب کے رشتے میں بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ آپ میں اور خبط میں صرف اتنا فرق ہے کہ خبط سے سرفراز ہونے کے بعد انسان کو ایک خاص شے کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جچتی۔ لیکن آپ سے سابقہ پڑنے کے بعد اُس خوش نصیب کو کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں رہتا بس ایک دھن ہر وقت سوار رہتی ہے۔ دیوانگی کے اس درجہ پر آکر انسان کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسرے حوائج ضروری کی فضول پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ فطرت نے بالکل ہی مجبور کردیا تو خیر، ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں۔ کھانا مل گیا کھالیا، نہ ملا مانگنے کی ضرورت نہیں۔ نیند نے مجبور کردیا تو جہاں سینگ سمائے پڑکر سو رہے۔ بچھونا کرنے کی نہ ضرورت نہ

فرصت، ایسے لوگوں کو بے تکلف مراقی کہہ دیا جاتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اس کا بُرا بھی نہیں مانتے۔ سر کی ایک ہلکی سی جنبش یا لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ اس خطاب کے شکریہ میں پیش کر دی اور بس۔ البتہ یہ مراقی لوگ ہمیشہ بیکار ہی نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرزد ہو جاتے ہیں کہ اچھے اچھوں کو رشک ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ مراقی جنھیں لیڈری کا مراق ہوتا ہے عوام الناس کے بہت کام آتے ہیں مینڈکوں کی طرح ان کی پیداوار کا بھی ایک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ لیڈری کے مراقیوں کی بہار دیکھنی ہو تو کسی الیکشن کے منتظر رہیے۔ سینکڑوں کی تعداد میں جوتیاں چٹخاتے نظر آ جائیں گے۔ نہ کھانے کی خبر، نہ پینے کا ہوش، بس قوم کی فکر ہے۔ بدھو نانبائی کا بچہ مر گیا آپ جنازہ اُٹھائے سب سے آگے آگے۔ کلو حجام کی ماں کا تیجا ہے۔ آپ انتہائی شورٹ سنڈ سے چھنے پڑھ رہے ہیں۔ خیراتی بلیہ دار کے ولیعہد کی ختنہ ہوئی ہے آپ شیرینی کی طشتریاں تقسیم کر رہے ہیں۔ دولت سرا میں خواہ ملیریا نے مورچہ جما رکھا ہو، لیکن قوم کی خدمت بہر حال فرض ہے۔

باقی

صادق حسین قیصر میرٹھی

دھنک

کرنوں کے چھینٹوں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری
جوبن پر ہے دھنگ راج کی رنگین راجکماری
چندری اپنی اُڑا رہی ہے برکھا رُت کی کنواری

اندر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رہ رہ کر پچکاری
یا کر کے اشنان لکشمی سُکھا رہی ہے ساری

ساغر نظامی

بہشتِ گم شدہ

(حکیم سیّد احمد رشید زیبا فیض آبادی)

شبابِ شوق تھا اُمید کی جوانی تھی
شروعِ حسّ محبّت کی زندگانی تھی

زبانِ گُل کی خموشی بھی نغمہ خوانی تھی
ہر ایک غنچے پہ چھائی ہوئی جوانی تھی

فضا تمام بہشتِ جمالِ معصومی
کہ مایہ دارِ حجاباتِ لنترانی تھی

گھٹائیں آتی تھیں پیغام میکشی لیکر
یہ بادہ خوار پہ ساقی کی مہربانی تھی

بہارِ صبح تصدّق، وہ کوہسار کی شام
نفس نفس میں جہاں عمرِ جاودانی تھی

نسیمِ صبح جو گاتی تھی سرمدی نغمے،
شراب ریز تھی، پُرکیف تھی، سہانی تھی

اُڑا رہی تھی صراحی سے جام میں کوئی شے
بہت لطیف سی، ہلکی سی، ارغوانی تھی

بہم تھے شورش و تسکیں کے ایک جا منظر
اِدھر نگاہِ محبّت اُدھر جوانی تھی

ستارے عارضِ افلاک پر چمکتے تھے
یہ تمام کی ذرّوں پہ ضوفشانی تھی

نظر نظر میں لطافت، نفس نفس میں بہار
تخیلّات کہیں اک جنّتِ معانی تھی

برس رہی تھیں گھٹائیں تری نوازش کی
کہ ذرّے ذرّے میں سرمستیٔ جوانی تھی

تجلیّات کا تھا اک ہجوم نظروں میں
مری نگاہ بھی فردوسِ غیر فانی تھی

حریم قدس کے پردے اُٹھے ہوئے تھے تمام
میں باریابِ محبت تھا کامرانی تھی

نیازِ عشق کے آگے جھکا ہوا تھا حسن
کہ داستانِ محبت تری زبانی تھی

نظر نظر تھی تری التجائے پیہمِ عشق
نفس نفس میں ترے سوزشِ نہانی تھی

حسین جسم پہ تھا لرزشِ خفی کا اثر — شریر آنکھوں سے پیہم گہر فشانی تھی
خوشا وہ عہدِ مسرت زہے سرورِ خیال — نشاطِ کیف تھا، راحت تھی، شادمانی تھی
کہاں سے لائیے وہ زندگیٔ کیف و جمال — وہ زندگی نہ تھی اک خواب تھا کہانی تھی

بیا کہ تازہ نما داغ ہائے سینۂ من
بیا کہ غرقِ مسرت شود سفینۂ من

پوجا:-

میں پجاری ہوں پجاری!

جب میں ابھی بچہ تھا چپ چاپ مریض، منحنی اور میرے ماں باپ بچپن سے گھبراتے تھے تو میں اپنی نانی اور خالہ اور نانا سے لپٹا رہتا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور مجھے ہم عمروں میں آوارہ گردی کی اجازت نہ ملی تو میں اپنی آیا اپنی الماری اور اُس کے ایک ایک کونے سے چمٹا رہتا

جب میرے دماغ میں ا، ب، ت ڈالی گئی اور خشک کتابوں کی زنجیروں نے مجھے جکڑ لیا تو میں نے مذہب، شاعری سے ربط پیدا کر کے ان کو اپنا تنہا راز داں بنا لیا۔

میں جو پجاری ہوں ہمیشہ پجاری ہی تھا۔

برسوں میں اپنے دل کے نگار خانے کو آراستہ و پیراستہ کرتا رہا کہ شاید کوئی اِس کی سیر کو آ نکلے۔ لیکن اِس خاموش گنبد میں صرف تنہائی کی آوازیں رات دن اپنا سر ٹپکتی رہیں تو جب اور کوئی بُت نہ ملا تو میں اپنے رنج والم ہی کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر یوں گر پڑا کہ آسمانوں پر بھی دھوم مچ گئی کہ دیکھنا، لینا، یہ پجاری ہی پجاری!!

پھر قسمت نے اور چال چلی اور میری فطرت نے ایک اور فریب کھایا۔ کسی کی کمائی ہوئی دولت میری ہو گئی جس نے مجھے اپنی تنگ آغوش میں لے لیا۔ تو میرا کیا تھا میں گوشہ گیر اِس سے بھی ہمکنار ہو گیا پھر جب میں نے ایک رفیق زندگی کو حاصل کیا تو محض اِس کی خوشی اپنا معمول ہو گیا اِس کے نام پر ایک مندر کھڑا کر دیا لیکن شاید ایک پیکر محبت مجسم وفا پجاری کو کافی نہ ہوئی تو میں نے مندر کے نزدیک و دور اپنے تصورات و توہمات کا ایک بے پایاں باغ و صحرا پھیلا دیا جس میں خیالوں کے پھولوں کی اور کبھی کبھی کانٹوں کے ذرّوں کی پوجا میں نے بڑے شد و مد سے شروع کر دی۔ میں جو ہمیشہ ایک پجاری تھا۔ اب بھی ایک پجاری ہوں! (میاں بشیر احمد بی۔ اے آکسن)

عالیجناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث

اِس رفیع الشان خاندان کا سلسلہ اویس قرنی رضؓ سے ملتا ہے۔ اِن کی دسویں پشت میں اویس ثانی گزرے ہیں جو مدینہ میں اوقاف کے متولی تھے اور یہ اپنے فرزند محمد علی کو لیکر وارِدِ ہندوستان ہوئے۔ اور بہ زمانۂ عادل شاہ بیجاپور میں آکر سکونت اختیار کی۔ اِس خاندان کے اکثر اراکین نے اِس ریاستِ اَبدمدت کی مدارالمہامی جیسی گرانمایہ خدمت انجام دیں، آج دکن میں صرف ایک یہی عظیم القدر، قدیم خاندان ہے۔ جس کے تمام معزز ارکان نے اپنی ذاتی شجاعت، دلیری، لیاقت اور دولت سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے کہ جس کے باعث ہمیشہ موردِ الطافِ خسروانہ رہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اعزاز و اکرام اس ریاستِ ابدمدت میں اِس جلیل القدر اور رفیع الشان خاندان کو حاصل ہیں وہ دوسروں کو کم ہیں۔

ہمارے معزز صاحب تذکرہ نواب میر لائق علیخان مرحوم منیر الدّولہ عماد السلطنت، سالار جنگ ثانی (سابق مدارالمہام) کے اکلوتے فرزند نواب میر سعادت علیخان مرحوم منیر الملک غیور جنگ، شجاع الدّولہ کے حقیقی بھتیجے اور نواب میر تراب علیخان مرحوم مختار الملک، سر سالار جنگ اوّل جی۔ سی۔ ایس۔ آئی (سابق مدارالمہام) کے پوتے ہیں۔ آپ سالار جنگی خاندان عالیشان و خانوادۂ درگاہ قلی خان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ولادت یوم جمعہ ۱۴ شوال المکرم ۱۳۰۶ھ م ۱۳ جون ۱۸۸۹ء م ۶ امرداد ۱۲۹۸ف میں ہوئی —— ولادت کے ایک ماہ بعد آپ کے عمّ بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اِس لئے حضور نظام (غفران مکان) نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ آپ کی کمسنی کی وجہ سے آپ کی جاگیر اور جائداد و املاک زیر نگرانی سرکار لے لی گئی اور خاص طور پر معتمد صاحب مالگذاری سرکار عالی اِس معزز اسٹیٹ کا انتظام کرتے رہے

۱۳۱۶ھ میں بتقریب جشن سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت غفران مکان نے آپ کو خطاب خان بہادری و سالار جنگی ثالث و منصب دو ہزار و پانصد سوار و علم و نقارہ سے سرفراز فرمایا۔ آپ نے اولاً بطور خانگی لائق استادوں سے گھر پر اور بعد ازاں مدرسۂ عالیہ (اس مدرسہ کی ابتدا سر سالار جنگ اوّل مرحوم کے ہاتھوں محض امراء و رؤسا کے بچّوں کی تعلیم کے لئے ہوئی تھی) میں شریک ہو کر اعلیٰ پیمانے پر تعلیم حاصل فرمائی، آپ علوم مشرقی و مغربی میں لیاقت تامّہ رکھتے ہیں، اردو، فارسی عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں مثل اہل زبان کے گفتگو فرماتے ہیں۔ آپکی تحریر اور تقریر اردو، فارسی اور انگریزی نہایت شستہ اور دلچسپ ہوتی ہے۔ بوجہ ذہانت آپ کا زمانۂ تعلیمی بہت اچھا گزرا۔ الحاصل آپ لیاقت و قابلیت میں اپنی آپ نظیر ہیں، شکار، نیزہ بازی، شہسواری پولو، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور دیگر مردانہ کھیلوں میں بھی آپ کو مشق کرائی گئی۔ ان کھیلوں میں بھی آپ نے مہارت تامّہ حاصل فرمائی اور آپ کو بجد دلچسپی بھی ہے۔ خصوصاً پولو میں آپ کو اچھی مشق حاصل ہے۔ آپ کی ٹیم موسوم بہ "سالار جنگ" اپنے نمایاں کھیل کی وجہ سے آج تمام ہندوستان میں مشہور و معروف ہے۔ آپ کی جاگیر کا رقبہ (۱۴۸۰) مربع میل یعنی ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست کی برابر ہے اجنٹا کی کانیں اور مشہور عالم غار آپ کی جاگیر میں واقع ہیں، جاگیر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں دو لاکھ اور کئی ہزار تھی، علاقہ مقبوضہ میں کئی عدالتیں اور جیل ہیں، جاگیر کی سالانہ آمدنی علاوہ دیگر جائداد کے بارہ لاکھ اور پچاس ہزار ہے۔ آپ ان جاگیرداروں میں ہیں جنھیں فوجی، عدالتی، کوتوالی وغیرہ کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں آپکی جاگیر واگزاشت ہوئی۔ اسی سال راجہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت سرکار عالی کے رخصت کے سلسلے میں تین سال کے لئے آپ مدار المہام مقرر ہوئے گو آپ منصرم تھے، لیکن آپکے اختیارات مستقل مدار المہام کے برابر تھے اور ۱۹۱۴ء میں آپ کو مستقل مدار المہام مقرر فرما کر اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ، نے آپ کو ایک لاکھ کا گراں بہا خلعت عطا فرمایا۔ اور دسمبر ۱۹۱۴ء میں آپنے چھ ماہ کی رخصت پر خدمت سے علیحدگی اختیار کی۔ آپنے ہندوستان، عراق، عرب ایران اور یورپ کے تمام شہروں کی سیر فرمائی۔ نیز دو مرتبہ یورپ تشریف لے گئے۔ آپکا یورپ کے سفر کو جانا گو سیر و سیاحت پر مبنی تھا لیکن آپ نے ان سفروں میں جو زبردست معلومات حاصل

فرمائی وہ حیطہ تحریر سے باہر ہے ۱۳۴۸ھ میں عراق عرب، مصر و شام، بیروت، بیت المقدس اور ایران کا سفر فرمایا اور زیارت ائمہ علیہم السلام سے مشرف ہوئے۔ حال ہی اور آخر ۱۳۵۲ھ میں آپ نے علاج کی غرض بار سوم یورپ کا سفر فرمایا اور بہ صحت تمام ماہ دوم ۱۳۵۳ھ میں وطن واپس آئے آپ کو اخبارات و رسائل اور کتب بینی کا نہایت شوق ہے۔ چنانچہ صدہا رسائل اور اخبارات کے آپ سرپرست اور معاون ہیں۔ شمالی اردو زبان کی مشہور اور مستند کتاب بادۂ مشرق مجموعۂ کلام حضرت ساغر نظامی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ ——— آپ علم دوست، سلیم الطبع، سیر چشم، دریا دل شریف پرور، کرم گستر، خوش اعتقاد، اولوالعزم اور عالی ہمت امیر ہیں۔ آپ کے الطاف و عنایات اکثر علماء، شعراء، ادبا، فقراء اور سائرین کے حال پر مبذول رہتے ہیں اور آپ کے در دولت سے ہزارہا اشخاص فیض یاب اور مستفیض ہوتے ہیں۔ سخاوت کو آپ پر ناز ہے کیوں نہ ہو آپ نواب میر تراب علی خاں مرحوم کے چشم و چراغ اور نواب میر لائق علی مرحوم حاتم وقت کے صاحبزادہ ہیں۔ آپ کی شگفتہ مزاجی، خوش خلقی اور فیاضی میں اپنے دادا نواب میر تراب علی خاں مرحوم سالار جنگ اوّل کے قدم بقدم ہیں۔

آخر میں ہم خوش اعتقادی کے ساتھ آپ کی عمر و دولت، عزت و اقبال و صحت کے لئے بارگاہ صمدیت میں بصد خلوص دعا کرتے ہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

*

نظر کرم کی فراوانیوں پہ پڑتی ہے
پھر اپنے دامن خالی کو دیکھتا ہوں میں

ساغر نظامی

"تم اب بھی یاد آتے ہو"

تم اب بھی یاد آتے ہو بہارِ منظر بن کر
تم اب بھی دل میں رہتے ہو زِ سرتا پا اثر بن کر
تم اب بھی دل پہ چھا جاتے ہو انوارِ قمر بن کر
میں سچ کہتا ہوں رہتے ہو حجاباتِ نظر بن کر
وفورِ چشمِ تر بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

یہ مانا غیر کے گھر گلفشاں بھی ہو گئے ہو تم
یہ مانا ماورائے جسم و جاں بھی ہو گئے ہو تم
یہ مانا میری نظروں سے نہاں بھی ہو گئے ہو تم
دلِ وحشی پہ گو نامہرباں بھی ہو گئے ہو تم
مگر جانِ خلش بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

نہ میرے دل میں ہے ارمان و شوقِ زندگی باقی
نہ گلزارِ تمنّا میں ہے کوئی دل کشی باقی
نہ امیدوں کے چہرے پر کوئی رونق رہی باقی
اگر باقی ہے تو جذبات کی ہے بیکسی باقی
مگر ہمرازِ دل بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

نہ دریا کی ترنّم زائیوں میں چین ملتا ہے

نہ دشت و کوہ کی تنہائیوں میں چین ملتا ہے
نہ اہل عقل کی دانائیوں میں چین ملتا ہے
نہ اپنے درد کی گہرائیوں میں چین ملتا ہے
مگر تسکین جاں بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

اگرچہ قوّتِ قلبِ حزیں پر اپنی نازاں ہوں
میں اپنی حالت پُر درد پر ہر چند خنداں ہوں
تمھیں گو بھول جانے کیلئے ہر وقت کوشاں ہوں
مگر میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری پہ حیراں ہوں
طلسمِ دلکشی بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

تمھاری یاد میں رونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
یہ دامانِ الم دھونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
تمھاری راہ میں کھونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
دعائے مستقل ہونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
مگر اشک و دعا بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

میں اپنی آرزو کی زندگی کو تلخ پاتا ہوں
میں اپنے آنسوؤں کی نہر میں خود ڈوب جاتا ہوں
در و دیوار کو اب اپنا افسانہ سناتا ہوں

میں اپنی روح کی خلوت میں اب روتا ہوں گاتا ہوں
سراپا ہمنشیں بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

پریشاں ہو کے جب بستی سے کوسوں دور جاتا ہوں
جب اپنے دل ہی میں روتا ہوا مجبور جاتا ہوں
شراب کیف غم سے ہو کے جب مخمور جاتا ہوں
جب اپنے درد کی کیفیتوں میں چور جاتا ہوں
تو میرے ہم سفر بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

قمر ہوتا ہے جب بزم فلک میں انجمن آرا
فضا ہوتی ہے جب نغمات سحر افگن کا گہوارا
سرور و کیف میں جب ڈوب جاتا ہے چمن سارا
فنا جب ٹوٹ کر ہوتا ہے گردوں پر کوئی تارا
شکست ساز دل بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

دکھا دیتا ہے دل جب کوئی طعنے کی چبھن بنکر
نظر آتی ہے دوشیزہ کوئی جب یاسمن بنکر
مٹا دیتی ہیں جب مجبوریاں دار و رسن بنکر
تمنا دل میں آتی ہے محبت کا کفن بنکر
تو میرے نوحہ خواں بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو

تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

مرے جذبات پر جب سارا عالم تنگ ہوتا ہے
دلِ پُر غم جب آمادہ برائے جنگ ہوتا ہے
زمانہ جب مرے سر کے لئے اک سنگ ہوتا ہے
مری ہستی پہ جب طاری فنا کا رنگ ہوتا ہے
تو پیغامِ سکوں بن کر —— تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

خلش صدیقی بی۔ اے لکھنوی

ماضی

تو اپنی معصوم ابدیت کی گود میں جھلمل جھلمل کرتا نظر آتا ہے تیرے عہد کی مسرتیں مجھے اپنی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہ میرا دامن چھوڑ کر مجھے میرے حال کے گرداب میں جس کے چکر کی عمر بقدر یک لمحہ ہے غوطہ زنی کے لئے چھوڑ دیتی ہیں۔

اے ماضی تیرے عہد کے سب زخم پھول معلوم ہوتے ہیں اور مستقبل کی مسرتیں زخم کاری کی موہوم اُمیدیں، جب تو میرے جسم کو چھوتا ہے تو مجھے آرام لذت اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ جب حال مجھ سے مس کرتا ہے تو میں ایک جامد شئے معلوم ہوتا ہوں اور جب مستقبل اپنے بازو میرے شانوں سے مس کرتا ہے تو میں ایک طلسمِ لاینحل سے ہمکنار ہو جاتا ہوں۔ یہ طلسم مسرت وغم، کامیابی وناکامی، موت و زندگی۔ ارتقا و پستی، حسن و عشق، نامرادی و شادکامی، گلشن و صحرا اور عدم و وجود کا ایک ہنگامہ بن کر مجھ کو محیط ہو جاتا ہے۔ اے ماضی میرا حال دیکھ اور اپنی گود میں مجھے ابدالآباد کے لئے چھپا لے۔

ساغر

شباب کی فتح

(سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

"کائنات اپنے پیدا کرنے والے کو معلوم کرنے میں قاصر رہی ہے" یہ الفاظ کہے اور جمشید پھر ایک گہری فکر میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں کے اندر تمام عالم پر شب کی تاریکی چھا گئی۔ چاند روپوش تھا۔ لیکن خلائے ارمغانی میں ستاروں کی حکومت قائم ہو گئی۔ آسمانی دیوتاؤں کا رہبر مشتری اپنی تمام درخشانیوں کے ساتھ سنہری چادر خود اوڑھے ہوئے برآمد ہوا۔ جمشید مستغرق تھا۔ یکایک موسم گرما کی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے باغ میں یاسمین اور ملکۂ شب کی اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے جمشید تک پہونچے اور اُس کو بیدار کر دیا۔

قدرت کی ہزار زبانیں اس سے ہمکلام ہونے کے لئے بیقرار تھیں، ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ آج جمشید کے کفر کو توڑ کر اس منکر الٰہی کا دل حقیقت الٰہیہ سے منور کر دیا جائیگا

"پیدا کرنے والا۔ علت العلل۔ سبب اوّل، یہ سب اصطلاحات ظنی ہیں۔ انسان اپنے جہل کا اعتراف کرتا ہے۔ اسباب کا ایک سلسلہ خود اپنی عقل سے بنایا اور جب ابتدا معلوم نہ کر سکا تو ایک نقطہ پر لا کر انتہا کر دی۔ اصل مقصد دل کو اطمینان بخشنا تھا۔ اس لئے انسان کے تخیل نے خدا کا تصور کیا"

رات کی تاریکی کے ساتھ جمشید کے شکوک بڑھتے جاتے تھے۔ فضا کی خاموشی نے قلب و دماغ کو یکسوئی عطا کر دی۔ اس لئے خیال و فکر الٰہیات کے تمام گوشوں پہ نظر حقارت ڈالتے ہوئے الحاد و زندقہ کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ لے جا رہے تھے۔

جمشید کی عمر اس وقت ۲۲ سال سے زائد نہ ہوگی۔ میانہ قد، خوبصورت آنکھیں شباب کی سرخی اور قوت ہر عضو بدن سے ٹپک رہی تھی چہرے پر متانت، انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ سے زندگی کو سنجیدہ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ تحصیل علم میں فلسفہ کا شائق تھا اور باوجودیکہ اس مضمون میں ایک ہندوستانی یونیورسٹی کی آخری ڈگری حاصل

کر چکا تھا۔ لیکن ہنوز قدیم و جدید فلسفہ کے نظریات اس کے پیش نظر رہتے تھے اور ان پر غور و فکر کیا کرتا تھا۔ طبیعت اِس نوعمری میں اِس درجہ دقیق ہو چکی تھی کہ اشیار کا ظاہری حسن اِس کے نزدیک ایک بے معنی چیز تھا۔ اِس کے استغراق و تفکر کو کسی کے پاؤں کی آہٹ نے ختم کر دیا۔ جمشید نے سر اُٹھایا اِس کی پشت کی طرف دو جھاڑیوں کے درمیان باغ کی ایک روش پر ایک جوان لڑکی برقی مشعل ہاتھ میں لئے خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ آنکھیں کسی چیز کو تلاش کرنے میں مشغول تھیں۔ جمشید نے لڑکی کو دیکھا اور بادل ناخواستہ کسی قدر بھاری آواز سے اپنی جائے نشست کی طرف لڑکی کو آنے کی دعوت دی ....

لڑکی۔ " بیوقوف! کیا اپنی تمام عمر اِن چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے میں صرف کر دے گا جو تیری عقل و ادراک سے بہت بلند ہیں ....

جمشید! ذرا نظر اُٹھا کر دیکھ۔ کائنات کا ہر ذرّہ تجھے پیغام مسرت پہونچا رہا ہے، زہرہ اپنے حسن و جمال کو تیرے باغ کے تالاب میں دیکھ رہی ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ میں فطرت کا ایک شاہکار ہوں۔"

جمشید نے جو اِس مداخلت سے کسی قدر چیں بر جبیں تھا۔ برجیس، کی طنزیہ خطابت کو ٹھنڈے دل سے سُنا۔ اور پھر کچھ سوچ کر کھڑا ہو گیا۔ فلسفہ کے خشک اور دقیق دماغ نے جمشید میں رقیق جذبات کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

برجیس ایک ہمسایہ لڑکی تھی۔ معیار حُسن کے لئے کوئی کُلیہ نہیں ہو سکتا۔ انفرادی ذوق اپنا اپنا معیار جداگانہ رکھتا ہے لیکن برجیس بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی سوسائٹی نے اُس کو ضرورت سے زیادہ شوخ بنا دیا تھا۔ اِس کی تعلیم معمولی تھی لیکن خلقی ذہانت اور تعلیم یافتہ گھرانے کی تربیت نے باقاعدہ تحصیل علم کی کمی کو پورا کر دیا تھا اور اِس کی معلومات عام مسائل پر اتنی کافی تھی کہ کسی علمی صحبت میں وہ مجبور اور عاجز ثابت نہیں ہوتی تھی، جمشید ایک خشک مزاج فلسفی تھا۔ اور اِس خشک انداز کے ساتھ برجیس کا دوست تھا۔ لیکن برجیس کے عمیق ترین گوشہ دل میں جمشید کے لئے ایک رقیق جذبہ موجود تھا جس کو وہ کبھی کبھی نادانستہ الفاظ میں ظاہر کر دیا کرتی تھی

برجیس! تمہاری نرگسیت بڑھتی جاتی ہے۔ فطرت کا شاہکار، ! فطرت ہے کیا چیز؟

کبھی تم نے غور کیا" جمشید نے متانت کے ساتھ کہا۔

"تمہارے دماغ کے سوا ہر چیز فطرت ہی فلسفہ کے دور از کار مباحث نے تمہارے دماغ کو البتہ غیر فطری بنا دیا ہے۔ جمشید! کیا تم محبت سے بالکل ناآشنا ہو؟" برجیس نے سوال کیا۔

میں ہر اُس چیز سے ناآشنا ہوں جو حقیقت سے دور ہے۔ محبت اور نفرت دو جذبے ہیں، دونوں ناپائدار۔ تجربہ سکھاتا ہے کہ محبت کے مقابلے میں نفرت زیادہ پائدار ہوتی ہے" جمشید نے جواب دیا اور پھر کچھ سوچ کر برجیس سے پوچھا "برجیس! تم نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟

"محض اس لئے کہ تم کو الحاد کے قعر عمیق میں گرنے سے روکوں" برجیس نے کہا۔

جمشید نے یہ الفاظ سُنے اور مسکراتے ہوئے برجیس کے داہنے شانے کو پکڑ کر کہا۔

"کس قدر خوبصورت فریب ہے۔ حقائق اشیاء کا معلوم کرنا الحاد ہے؟ برجیس کائنات بنا ہے؟ کہاں سے آئی؟ اس کو کس نے بنایا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ انسانی فکر نے ارتقار کے تلف مدارج میں مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ تصورِ الٰہی ابتدا میں ہیبت ناک قوتوں تک محدود ما۔ پھر خدا کو سزا اور جزا کا آلہ بنایا گیا۔ بالآخر انسانی تخیل کی بلند پروازیوں نے جلال و جمال قدرت کمال کا ایک نادر الوجود اور ما فوق الادراک تصور پیش کیا۔ ایک طرف یہ وجود ما فوق الادراک ر دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ اس کو تسلیم کرو۔ کیوں تسلیم کرو؟ اس لئے کہ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس پر کیوں ایمان لاؤ؟ محض اس لئے کہ چند مصلحین نے کہا ہے کہ حقیقت یہی ہے۔ وہ انسان و ایک ذرّے کی ماہیت سے واقف نہیں وہ ایسے وجود کی ذات وصفات کا پتہ دیتا ہے جو جملہ کائنات کی خالق ہے۔ آخر اس عاجز انسان نے اس زبردست حقیقت کو کیونکر معلوم کیا۔ جبکہ وہ دو اعتراف کرتا ہے کہ وجود خداوندی ما فوق الادراک ہے۔ برجیس دوسروں کی طرح تم بھی اس نما فریب میں مبتلا ہو۔ محبت بھی اسی سلسلے کی ایک نازک کڑی ہے۔ تمہاری شوخ ادائیں اور امیں اُڑتے ہوئے لمبے لمبے گھنے بال اس محبت کی دعوت دے رہے ہیں جو انسانی زندگی سب سے بڑی لعنت ہے۔ کتنے انسان ہیں جنھوں نے فلسفۂ محبت کے ہاتھوں اپنی زندگی کو تباہ دیا۔ برجیس رقیق جذبات بالآخر بھاپ کی طرح اُڑ جاتے ہیں اور پھر زندگی کی افسردگی تمام

قوائے عمل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ تم فطرت کا ایک کھلونا ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنے مقصد حیات کو خیرباد کہہ کر تمھارے ساتھ کھیلنا شروع کر دوں"۔؟

اِن آخری جملوں نے جہاں برجیس کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا وہاں اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ جمشید نے اِس کی توہین کی ہے۔ دماغ میں ایک تلاطم برپا تھا۔ لیکن برجیس نامہربان ہونا نہیں چاہتی تھی۔ آج ارادہ کر کے آئی تھی کہ جمشید پر فتح حاصل کرے گی۔ وہ اِس سے محبّت کرتی تھی۔ جمشید کے الفاظ نے گویا تودۂ بارود میں آگ لگا دی۔ وہ دورِ حاضر کی مہذب لڑکی تھی۔ قدیم زمانہ کی بُزدلانہ شرم و حیا اِس کے نزدیک مردوں کے سامنے اعترافِ شکست تھا۔ جمشید سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی اور صاف و سُریلی آواز میں کہا۔

" خدا اور اُس کا تصور ایک قدیم تخیّل ہے۔ جمشید تم اِس کو نہیں مانتے۔ فرض کرو کہ خدا موجود نہیں لیکن ہم اُس کے وجود کے قائل ہیں تو اِس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ لیکن جمشید اگر خدا موجود ہے جیسا کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے صناع کا پتہ دیتا ہے اور تم اس سے منکر ہو تو بتاؤ تمھارا کیا حشر ہوگا؟ خدا کا وجود یا عدم وجود دونوں ظنّی چیزیں ہیں اور اگر یقین نہیں تو مصلحتاً ہی تم کو اِس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ نفسیاتی طور پر ہر اِنسان اطمینانِ قلب چاہتا ہے۔ اب ذرا غور سے دیکھو کہ اطمینانِ قلب تم کو حاصل ہے یا ان کروڑوں بندگانِ خدا کو جو خدا اور اوس کی امداد پر ایمان رکھتے ہیں۔ تمھارے دماغ کا ہر گوشہ خشک ہو گیا ہے اور اگر تمام عمر حقائقِ اشیا معلوم کرنے میں صرف کر دو گے تو بھی کچھ معلوم نہ ہوگا۔ پھر دانستہ زندگی کی مسرّتوں کو کیوں برباد کرتے ہو۔ ہوا کو دیکھو پھولوں کی نازک پنکھڑیوں سے چھُو کر ان کی مہک کو تمھارے پاس پہونچا رہی ہے۔ آسمان کے ستارے تمھاری طرف جھکے جاتے ہیں اور ہلکی ہلکی روشنی پہونچا رہے ہیں، زمین تمھارے بوجھ کو اپنے سینے پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ کائنات کا یہ نظام اور ارتباط محض محبّت پر قائم ہے اگر تم کو اپنے نظریوں سے محبّت نہ ہو تو تحقیق و اکتشاف کا دروازہ بند ہو جائے۔ حقیقتِ اشیاء معلوم کرنے کا ذوق تمھیں کس قدر محبوب ہے۔ لیکن محبّت کو سب سے بڑی لعنت سے تعبیر کرتے ہو خدا جانے تمھارا توازنِ دماغی قائم ہے یا نہیں۔ میں فطرت کا کھلونا ہوں؟ تم اِس سے کھیلنا نہیں چاہتے۔ جمشید تم نامہربان ہی نہیں غیر مہذب بھی ہو۔ میں نے کب تمھیں اپنی محبّت کی دعوت دی ہے؟

تم پر ترس کھاتی ہوں، خدا تم پر مہربان ہے اُس نے تم کو حسین بنایا ہے۔ لیکن وہ جلد اپنے عطیہ کو واپس کرلے گا۔ چند برس تم اپنی زندگی مکمل طریق پر بسر کر سکو گے۔ شباب کے ساتھ تمہارا حسن اور اس کے ساتھ تمہاری فتحمندیاں بھی ختم ہوجائیں گی۔ ہر نیا دن تم کو ایک ہیبتناک انجام سے قریب کر رہا ہے وقت تمہارا رقیب ہے اور تمہارے گلابی رخساروں اور شباب میں چُور جسم کے ساتھ متواتر جنگ کر رہا ہے۔ کیا اُس وقت کا تصور کر سکتے ہو جب تمہارے گالوں پر جھریاں پڑ جائیں گی۔ آنکھوں کی روشنی رفتہ رفتہ زائل ہوتی چلی جائے گی۔ بغیر سہارے بیٹھ کر اُٹھ بھی نہ سکو گے۔ پھول کی نازک پنکھڑی مرجھا کر گر جاتی ہے۔ لیکن پھر اسی زمین سے دوبارہ پیدا ہو جاتی ہے تمہارا شباب جب جا رہا ہے گا تو اُس کی واپسی ناممکن ہے۔ شباب حیرت ناک لذتوں سے بھرا ہوا ہے۔ زندگی آج ہے اس کو رائیگاں نہ جانے دو۔ اس زمین و آسمان کے درمیان تمہارے خشک اور فرسودہ فلسفہ کے علاوہ اور دلچسپ چیزیں بھی موجود ہیں"

برجیس اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ وہ تھک گئی تھی۔ لیکن ہیجانی کیفیت اِس پر طاری تھی۔ کنکھیوں سے جمشید کے چہرے کا رنگ دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد جمشید نے مہر سکوت توڑی۔ چند قدم آگے بڑھ کر برجیس کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔ زبان سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جذبات کا سیلاب الفاظ کا ایک جملہ بھی مرتب نہ ہونے دیتا تھا۔ بالآخر ایک معنی خیز لہجہ میں کہا" برجیس! برجیس!! یہ ظلم ہے صنفی قوت کا ناجائز استعمال ہو تم جذبات سے اپیل کر رہی ہو"

برجیس نے ہلاکت آفریں تبسم کے ساتھ کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ جمشید صنفی قوت کا اعتراف کرے" برجیس کی فطری شوخی عود کر آئی تھی اور اب وہ ہر پہلو سے جمشید کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "جمشید! فلسفہ کے مالیخولیا نے تم کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے کی فکر میں ہمہ وقت اپنا دماغ خراب کرتے رہتے ہو۔ لیکن روزانہ کی عملی زندگی میں تمہارا علم ابھی ابجد سے بھی آشنا نہیں۔ میں صرف دوستانہ تعلقات کی وجہ سے تمہارے پاس آئی ہوں تم نے اِسے عورت کی کمزوری پر محمول کیا اور چونکہ آسانی سے تم مجھ سے بات چیت کر سکتے ہو۔ اِس لئے بعض اوقات میری توہین کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ یاد رکھو

آج کے بعد برجیس اور تم دونا آشنا شخصیتیں ہوں گی۔ تم اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کرو۔ برجیس آئندہ تمھارے ذوق وشوق اور تحقیقاتِ علمی میں مخل نہ ہوگی۔"

یہ برجیس کا آخری لیکن تیز حربہ تھا۔ عورت کے ترکش میں ایسے صدہا تیر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جمشید بالکل مبہوت تھا۔ برجیس کا ہر لفظ کیوپڈ کی بے پناہ کمان سے تیر بن کر برس رہا تھا۔ مقصدِ حیات کی تمام راہیں چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ فلسفہ بھاپ کی طرح دماغ سے اُڑگیا۔ برجیس حسن کی دیوی بنی ہوئی جمشید کے سامنے کھڑی تھی وہی آج اس کا مقصدِ حیات تھی اور اس کی پرستش جمشید کے فلسفہ کا نچوڑ۔ اس منکرِ خدا کی قلبِ ماہیت قابلِ دید تھی خدائے حقیقی پر ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو لیکن جمشید اس حُسن کی دیوی کا پرستار ضرور بن گیا تھا۔

"جمشید! کیا ہوا؟ کیا تمھاری تمام کائنات ایک ضعیف عورت کے ناپائدار حُسن نے پلٹ کر رکھدی۔ کچھ بتاسکتے ہو کہ اب کس منزل میں ہو؟" برجیس نے دریافت کیا۔

"برجیس! عورت کی قوت کا قائل ہوں میں اُس منزل میں ہوں جہاں نسلِ انسانی نے اصنام پرستی شروع کی تھی۔ یہ انسانیت کا ابتدائی دور تھا اور یہی میری زندگی کا آغاز ہے" جمشید نے کہا۔

"جمشید! میں تم سے محبت کرتی ہوں یہ عورت کی قوت نہیں ہے یہ شباب کا اٹل قانون ہے۔ نپولین نے بڑے بڑے تاجداروں کے سروں کو اپنے پیروں میں روند ڈالا لیکن حسن اور شباب کے مقابلے میں اکثر شکستیں اٹھانی پڑیں۔"

برجیس مسکرا رہی تھی۔ جمشید آگے بڑھا اور برجیس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر آخری نذرِ عبودیت پیش کردی .... یہ شباب کی فتح تھی۔

جمشید اور برجیس ایک کمرے میں بیٹھے ہیں اِن کا آخری سلسلہ گفتگو اس طرح جاری تھا

جمشید "برجیس تم ہی مقصدِ حیات ہو۔ تمھاری ذات نے محبت کی حقیقت مجھ پر روشن کی ہے میں تم کو پوجتا ہوں۔"

برجیس "مرد بہت خوشامدی اور چاپلوس ہوتا ہے۔"

جمشید "عورت بڑی خوشامد پسند اور جادوگر ہوتی ہے۔" ع عشق ازیں بسیار کردست و کند۔

مفلس امیر زادہ

(بسلسلہ ماسبق "پیمانہ" ماہ جولائی ۱۹۳۰ء)

از سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی

کرسٹی! جیرالڈ نے کہا "میں عنقریب کناڈا جانے والا ہوں۔ انگلستان میں کوئی ملازمت مجھے ابتک دستیاب نہیں ہوئی۔ روانگی سے قبل میں ایک مرتبہ اپنے اس کھوئے ہوئے آبائی محل کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس طرف چلا آیا۔

"میں ہر وقت آپ کو خوش آمدید کہوں گا" بوڑھے ملازم نے جواب دیا۔ لیکن کسی مزید گفتگو سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ کے خورونوش کا انتظام کروں۔ میں کمرے میں آگ روشن کرتا ہوں آپ وہاں تشریف رکھیں تھوڑی دیر میں کھانا بھی حاضر کردوں گا۔"

جیرالڈ اس تواضع کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن کرسٹی کی آنکھوں میں پختہ عزم کو دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ کرسٹی واپس گیا اور اپنی بیوی کو جیرالڈ کی آمد سے مطلع کیا۔ یہ نیک دل عورت بھی جیرالڈ سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنا اس کا شوہر۔ فوراً اٹھی اور ایک گھنٹے کے اندر کھانا تیار کردیا۔

"بہترین کھانا تیار کیا جائے"، کرسٹی نے اپنی بیوی کو مخاطب کرکے کہا۔ "اگر نیا مالک اعتراض کرے گا تو میں اپنی جیب سے اس کھانے کی قیمت ادا کردوں گا۔"

"ماسٹر جان (جیرالڈ) تمام مکان میں گھوم رہا ہے۔ میں نے ابھی اس کی آواز سنی تھی۔ شاید اپنی ماں کے کمرے میں اس کی تصویر سے باتیں کررہا تھا" یہ کہا اور اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ پھر ٹھنڈی سانس کھینچکر اپنے شوہر سے کہا "کاش کہ پرانا زمانہ واپس آجاتا"

کھانا تیار تھا۔ کرسٹی نے پرانے دستور اور آداب کے موافق کھانا چنا۔ امرا انگلستان کے گھرانوں میں ملازمین خاص سلیقہ اور شعور کو ملحوظ رکھتے تھے اور اس وقت بھی کرسٹی یہی سمجھ رہا تھا

کہ وہ اپنے آقا کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ جیرالڈ اندوہناک مسکراہٹ سے کچھ سوالات کرتا تھا اور کرسٹی بڑی گرمجوشی سے ان کا جواب دیتا تھا۔ یکایک سامنے والے دروازے پر گھنٹی بجی کرسٹی کا چہرہ فق ہو گیا۔ اور عرصہ تک وہ بت بنا کھڑا رہا اس غیر متوقع آمد نے جیرالڈ کو بھی متوحش کر دیا لیکن بہت جلد اپنے حواس درست کر کے اس نے کرسٹی سے کہا کہ "باہر جاؤ اور دیکھو کون ہے، شاید کوئی مسافر راستہ بھول کر اس طرف چلا آیا ہے"

خادم باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک جیرالڈ انتظار کرتا رہا اور پھر اپنے خیال میں مستغرق ہو گیا جیرالڈ کو اپنے پرانے آبائی مکان سے حد درجہ محبت تھی۔ اس کا خاندان پشتہا پشت سے یہاں رہتا چلا آیا تھا۔ زمانہ کی ناسازگاری نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ اس بیش قیمت محل کو فروخت کر دے ایک کمرے میں وہ کرسی پڑی ہوئی تھی جس پر اس کی ماں بیٹھا کرتی تھی۔ جیرالڈ بغور اس کرسی کو دیکھ رہا تھا تخیل کی آنکھوں نے پائن کو اس کرسی پر لا بٹھایا اور اس کو معلوم ہونے لگا کہ پائن ٹکٹکی باندھے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لیڈی اپن کی ضیافت میں پائن سے اس کی آخری ملاقات ہو چکی اور اب شاید زندگی بھر اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا موقع نصیب ہو گا

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک تنومند آدمی جس کے سر پر مشکل سے چند بال باقی رہ گئے تھے اندر داخل ہوا "اس تمام ہنگامہ کا کیا مطلب ہے" آنے والے نے کرخت آواز میں دریافت کیا۔ اس کے پیچھے کرسٹی خوف زدہ کھڑا تھا اس کی طرف مڑ کر اس شخص نے اس سوال کو دہرایا اور غضبناک لہجہ میں ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انتہا ہے! میری عدم موجودگی میں تم میرے کھانوں اور میری شرابوں کو اپنے دوستوں کی ضیافت پر برباد کرتے ہو۔ تم جیسے ملازموں کو ملازمت میں رکھنے کا یہی انجام ہوتا ہے ڈلویل خاندان (جیرالڈ کا خاندان) کو دھوکا دینے میں تم کامیاب ہو گئے۔ لیکن مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اور تمہارا دوست دونوں چور ہیں۔

بوڑھے ملازم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ وہ اپنی توہین برداشت کر سکتا تھا لیکن پرانے آقا کی تذلیل اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ آگے بڑھا اور سخت لہجہ میں کہا۔ "آپ بغیر سوچے سمجھے گفتگو فرما رہے ہیں" اس شخص نے کہا "آج تم اپنا بوریا بستر

لے کر اِس مکان سے نکل جاؤ" اِس کی آنکھیں کھانے کی میز پر جمی ہوئی تھیں اور بار بار اسراف کا خیال اِس کو غضبناک بنا رہا تھا۔ جیرالڈ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑی متانت کے ساتھ اِس طرح گویا ہوا۔

جیرالڈ ایک شریف النسب امیرزادہ تھا اور "ہالم میز" کی عالیشان عمارت اِس کا آبائی مکان تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے جیرالڈ اِس مکان کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اِس کے خاندانی وکیل نے "ولیم مینارڈ" (پالن کا باپ) کے ہاتھ بیچ دیا۔ لیکن نہ جیرالڈ کو یہ معلوم تھا کہ مکان کس شخص کے ہاتھ بیچا گیا اور نہ ولیم مینارڈ جانتا تھا کہ مکان کا پہلا مالک کون تھا۔ جیرالڈ کناڈا کا سفر اختیار کرنے سے پہلے چھپ کر آخری بار اپنے آبائی مسکن کو دیکھنے آیا تھا۔ یکایک خلاف توقع ولیم مینارڈ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ قارئین کی سہولت کی غرض سے ہم چند لفظوں میں گزشتہ منظر کا اعادہ کرتے ہیں

جیرالڈ کھانا کھا رہا تھا۔ یکایک ولیم مینارڈ آ گیا۔ جیرالڈ کو یہاں دیکھ کر وہ بہت برہم ہوا اور پرانے ملازم کرسٹی کو سخت سست کہنے لگا۔ اِس کو خیال ہوا کہ کرسٹی اپنے دوستوں کی دعوت اِس کی عدم موجودگی میں کرتا ہے اور سامانِ خورونوش کو برباد کرتا ہے اِس لئے اِس نے غصہ کی حالت میں حکم دیا کہ جیرالڈ اور کرسٹی دونوں فوراً مکان سے نکل جائیں۔

"آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہالم میز" کے نئے مالک آپ ہی ہیں۔ میری موجودگی پر جس قدر بھی اعتراض فرمائیں وہ بجا و درست ہے اور میں مؤدبانہ اِس کی معافی چاہتا ہوں لیکن میرے دوست کرسٹی نے تمام عمر کبھی خیانت نہیں کی، جو کچھ اِس نے کیا میری خاطر سے کیا۔ قصور سراسر میرا ہی اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اِس کو ملازمت سے برطرف نہ کریں گے۔"

جیرالڈ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اِس کو پہچان لیا جائے۔ اِس نے اشارے سے کرسٹی کو بھی منع کر دیا تھا کہ اِس کا نام زبان پر نہ لائے۔ اِسی وجہ سے کرسٹی خاموشی سے اپنے پرانے آقا کی شان میں ناملائم الفاظ سنتا رہا۔

"تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ، سنتے ہو" نئے مالکِ مکان نے کہا۔ یہ شخص ولیم مینارڈ جوہری، پالن کا باپ تھا۔ پالن دروازے کے قریب اِس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا کر کہا۔

"مسٹر جیرالڈ!" اِس کی آواز نہیں نکلتی تھی، بڑی کوشش سے کہا "آپ سے

اِس طرح یکایک ملاقات کا ہونا بہت خوشگوار ہے"۔ جیر آلڈ سے اِس نے مصافحہ کیا اور پھر اپنے باپ کی طرف مڑ کر کہا "ابّا جان! میں آپ کا تعارف مسٹر جیر آلڈ سے کراتی ہوں یہ لیڈی آئرین کے رشتہ دار ہیں اور ...... اور ...... پالن کی آواز میں لکنت پیدا ہو گئی۔ پھر اپنے کو سنبھال کر کہا" اور میرے دوست ہیں"

"شاید مجھے یہ فخر حاصل ہے"۔ جیر آلڈ نے جواباً کہا۔

پالن کے دل میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ لیکن چونکہ جیر آلڈ کی طرف سے اعترافِ محبّت کی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی اس لئے اس کی فطری حیا رقیق جذبات کو صرف گوشۂ دل میں پنہاں رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ جیر آلڈ بھی اپنے افلاس کی وجہ سے اپنی محبّت کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا۔

"جیر آلڈ نے معذرت کرتے ہوئے ولیم مینارڈ کو بتا دیا کہ اِس مکان کا پہلے مالک وہ خود ہی تھا۔ ولیم نے اِس معذرت کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پالن خوش تھی کہ اِس کے باپ نے "ہالم منیر" خرید لیا تھا۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں قدیم خاندان کے اخراج پر بھی اس کو افسوس تھا۔ جیر آلڈ سے اس نے اپنے باپ کا تعارف کرانا چاہا لیکن ولیم مینارڈ کی فطری سنگدلی نے اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اِس کی لڑکی اِس اجنبی سے ایسی بے تکلفی سے کیوں بات چیت کر رہی ہے۔ بالآخر جیر آلڈ نے پست آواز میں پالن سے کہا۔

"اگر آپ کے والد بزرگوار میری جسارت کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تو کم از کم آپ ہی معاف فرما دیجئے"۔

پالن مسکرائی اور کہا "اِس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ بالکل قدرتی چیز ہے کہ آپ اپنے آبائی مکان کو دیکھنے چلے آئے۔ جہاں تک کرسٹی کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ ملازمت سے برطرف نہیں کیا جائے گا"۔

جیر آلڈ نے الوداع کہا، پالن کا دل دھڑکنے لگا، لیکن جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اس نے جواب میں کہا "خدا حافظ! ..... آپ جب انگلستان واپس آئیں تو وعدہ کیجئے کہ ہم سے ضرور ملئے گا"۔ جیر آلڈ مصافحہ کر رہا تھا اور اسکے ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی جاتی تھی۔ پھر کسی خیال سے اپنے کو سنبھال کر اس نے کہا "نوازش کا شکریہ۔ لیکن شاید میں انگلستان کبھی اپنی زندگی میں واپس نہیں آؤں گا باقی

تمہارا تصوّر

تمہارا تصوّر مجھے بہت کچھ یاد دلاتا ہے!

وہ لمحات، جو فانی خوشیوں سے معمور تھے،

وہ دن، جب زندگی کی بہجتیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں ——!

اور وہ بھولی بسری راتیں، جب ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے صبح کر دیا کرتے تھے!

وہ باتیں، جنھیں میں سمجھتی تھی کہ کبھی نہ ختم ہونے والی، اور غیر فانی ہیں —— لیکن وہ

درحقیقت اُس آواز سے زیادہ ناپائدار تھیں جو کلیوں کے شگفتگی کے وقت سُنائی دیتی ہے ——

وہ آج ماضی کے عمیق سکوت میں سو گئی ہیں، اِس طرح کہ اب کبھی دہرائی نہ جا سکیں گی!!

تمہارا تصور ایک پُر تسکین شعر ہے جس کے گنگناتے ہی میری روح وہاں پہونچ جاتی ہے

جہاں صرف تم ہو —— یا وہ خواب، وہ دلکش اور سہانے خواب، جو عہدِ ماضی میں میری روح نے

دیکھے تھے منتشر پڑے ہیں ——!!

اِسطرح جیسے چند نازک اور حسین پھولوں کی پنکھڑیاں تیز اور سرد ہوا کے جھونکوں سے

بکھر گئی ہوں!!

آنسہ حیا میرٹھی

برسات

(۱)

آج پھر سبزہ خلد آرا ہے
یعنی برسات کار فرما ہے

اوڑھ لی ہے زمیں نے سرتاسر
دلکش اور گہری سبز اک چادر

ہوگئے دشت آج لالہ زار
ہوگئے سبز پوش سب کہسار

باغ میں رنگ کا ہے ہنگامہ
دشت ہیں نزہتوں کا مجموعہ

کلیوں میں مسکرا رہی ہے بہار
پھولوں میں جگمگا رہی ہے بہار

سارے منظر ہیں آج گل پیرا
نور سے بھر گئے ہیں سب دریا

دشت ہیں سجدہ زارِ رنگ و بو
وادیاں جوئبارِ رنگ و بو

احمریں جھاڑیاں گلاب کی ہیں
اخضریں ڈالیاں گلاب کی ہیں

فیض فصلِ بہار جاری ہے
ایک ہمیں لکیر زندگی ہے

آج ہر شئے پہ چھا رہی ہے بہار
مجھ کو لیکن ستا رہی ہے بہار

(۲)

ہر چمن میں بہار کا سیلاب
رشکِ جنّت ہے عالمِ اسباب

پتہ پتہ ہے مستِ کیفِ بہار
ذرّہ ذرّہ ہے مستِ کیفِ بہار

کالی کالی گھٹائیں آتی ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں

ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے
دل پہ بے اختیار پڑتی ہے

نغمۂ کیف زا فضا میں ہے
کوئی بربط لئے گھٹا میں ہے

جھومتے ہیں تمام برگ و بار
ہنس رہے ہیں تمام لالہ زار

بلبلوں کی نوا ہے کیف بدوش
"پی کہاں" کی صدا ہے غارتِ ہوش

چھایا دریا پہ رنگِ شامِ کیف — اُس کی ہر موج ہے خرامِ کیف
شب کی گہری سیاہی میں ہر سو — جگمگاتے ہیں سینکڑوں جگنو
یاد اُن کی دلا رہی ہے بہار
آہ مجھ کو ستا رہی ہے بہار

(۳)

پھول ہنستے ہیں رقص میں ہے صبا — چھائی ہے میرے دل پہ غم کی گھٹا
میرے دل پر الم کی بارش ہے — یاس کی اور غم کی بارش ہے
عشرتیں آہ! میری دھندلی ہیں — خلوتیں میرے دل کی سُونی ہیں
اُلجھی ہے تارِ غم میں روح مری — دب گئی بارِ غم میں روح مری
بھینی بھینی ہوا ہے نکہت ریز — میرے آنسو مگر ہیں طوفاں خیز
یاد رہ رہ کے اُن کی آتی ہے — اور دل کو مرے ستاتی ہے
وہ، کہ ہیں عشق کے چمن کی بہار — ہوں تصوّر میں جن کے میں سرشار
کاش بے اختیار آجائیں — مثلِ ابرِ بہار آجائیں
آہ! لیکن یہ ہے خیالِ خام — صبح ہوگی نہ میرے غم کی شام
نغمۂ کیف گا رہی ہے بہار
آہ! مجکو ستا رہی ہے بہار

آنسۂ خورشید اقبال حیا میرٹھی

پیامِ بہار

کیا تجھے معلوم نہیں کہ بہار آگئی؟
بلبل کے محبت بھرے راگ، کیا بہار کا رنگین الہام نہیں ہیں؟
کوئل کی دُکھیاری لے، کیا بہار کا کافی ثبوت نہیں؟
یہ نمناک سبزہ،
نکھری ہوئی شاخیں،
رنگین پھول،
ندی کی مترنم لہریں، گھٹاؤں کی سیاہ دیویاں،
فضا کے اندھیرے راستوں کو چمکانے والے جگنو،
کیا یہ سب بہار کے رومان خیز پیامبر نہیں ہیں؟
پھر تجھے کیوں نہیں معلوم کہ بہار آگئی؟
کیا اِس لئے کہ میں تیرے دل کے کنول پر اپنی محبت کا مایوس راگ نہ چھیڑ دوں
اور تیرے دل کی کلی میری محبت کے لئے کِھلنے نہ پائے؟؟
جس طرح بند کنول کو بھونروں کی بھیرویں میں ڈوبی ہوئی بھنبھناہٹ جگا دیتی
ہے۔ آہ! تجھے معلوم ہے کہ بہار آگئی۔
مگر تو نے اپنی پلکیں جُھکا لیں، تاکہ میں سمجھ لوں کہ تو سو رہا ہے۔
اور ـــــ تو نے یہ رنگین پیام نہیں سُنا!

آنسہ گوہر اقبال حور

تیری محبت

(اثر:۔ بلقیس جمال صاحبہ جمال بریلوی)

تجھ کو اپنے نافۂ گیسوئے پیچاں کی قسم　　تجھ کو اپنے دوش پر زلف پریشاں کی قسم
تجھ کو اپنی سُرمئی چشم غزالیں کی قسم　　تجھ کو اپنے جلوۂ بیباک ورنگیں کی قسم
تجھ کو اپنے عارضِ گل ریز و خنداں کی قسم　　تجھ کو اپنے گوشۂ چاہِ زنخداں کی قسم
تجھ کو اپنے سُرخ ہونٹوں کے تبسّم کی قسم　　تجھ کو اپنے مست آنکھوں کے ترنّم کی قسم
تجھ کو میرے جذبۂ و جوشِ تمنّا کی قسم　　تجھ کو اپنے عشوۂ و اندازِ رعنا کی قسم
تجھ کو اپنے بیخودانہ بے نیازی کی قسم　　تجھ کو اپنی جادو داں جادو طرازی کی قسم
تجھ کو اپنے مضطر و شوریدۂ غم کی قسم　　تجھ کو اپنے وحشئ گیسوئے برہم کی قسم

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حال زار سُن
داستانِ درد تاریخِ دلِ بیمار سُن

تیری الفت مرہم زخمِ دلِ رنجور تھی　　تیری الفت روح و جانِ عاشقِ مجبور تھی
تیری الفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی　　تیری الفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی
تیری الفت کا مغنّی تھا ہر اک سازِ نفس　　نامِ عیسیٰ تھی ترا تحریکِ آوازِ نفس
تیری الفت تھی مرے دل کیلئے بوئے شراب　　ہر نفس تھا اس کی خوشبو سے محبّت کا گلاب
اُونگھنے لگتے تھے تارے جب خمارِ خواب سے　　تیری الفت جاگ اُٹھتی تھی کنارِ خواب سے
سینکڑوں کلیاں چٹکتی تھیں نمو کے جوش میں　　تیری الفت پھول بنتی تھی مرے آغوش میں
سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب برسات میں　　تیری الفت مُسکراتی تھی مرے جذبات میں

چاندنی راتوں کے کیف آگیں تجلیات میں تیری الفت برق تھی غم خانۂ جذبات میں

الغرض تیری محبت تھی سراسر حیات
کائنات الفت تھی مجکو تیری الفت کائنات

نجمِ سحر

ڈوب جا میرے قسمت کے تارے کی طرح ڈوب جا، اے صبح کے اداس اور زرد نجم سحر! تجھے اپنی پیلی پیلی سرسوں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی کرنوں کی قسم مجھے بھی اپنے ساتھ عدم کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنی تمام کائنات محرومی کے ساتھ ڈبو دے **بچے**! یہ دنیا کی امید میں غفلت کی نیند سو رہے ہیں **نوجوان**، یہ مستقبل کی دنیا کے کھویا الہڑ نیند میں غافل ہیں۔ ان کے دل صبح شباب ہوتے ہی کنول کی کلیوں کی طرح شگفتہ ہوجائیں گے **بوڑھے**! یہ آغاز و انجام کی خوفناک تصویریں، موت کے منتظر بیٹھے ہیں۔ کوئی سو رہا ہے کوئی غافل ہے کوئی موت کی طرح سرد پڑا ہے۔ مگر میں تیرے ساتھ ساری رات جاگتی رہی ہوں، میں مخلوقات میں سب سے الگ ہوں، مجھے سب کی نگاہوں سے بچا کر عدم کے سمندر میں ڈبو دے، میں نہ سونا چاہتی ہوں نہ غافل ہونا چاہتی ہوں نہ سرد پڑنا چاہتی ہوں، میں ڈوبنا چاہتی ہوں۔ ناکامی اور المناکی نے میری روح کو، میرے دل کو، میرے احساس کو، میری ساری کائنات کو، نراش کردیا ہے نراش! اے امید کی جھوٹی نشانی ڈوب جا اور مجھے بھی ڈبو دے۔

دنیا جس کے غافل پیکر کو تو تکتا رہا ہے رات بھر گھورتا رہا ہے عبرت و حیرت سے جائزہ لیتا رہا ہے۔ میرے اور تیرے ڈوبنے کا احساس بھی نہ کرے گی۔ اس بھلاوے میں مت رہ کہ کل کی شام کو تو پھر چمکیگا۔ آج کا ڈوبنا عمر بھر کا ڈوبنا ہے۔ دنیا صبح ہوتے ہی نئے تاروں کی جستجو میں گم ہو جائے گی اور سورج کو دیکھ دیکھ کر جیے گی۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ڈوب جا اور ڈبو دے

(سین)

بادۂ الہام

شعرائے عصر کے افکار

حضرت جگر مراد آبادی مدظلہٗ

(بطور خاص پیمانہ کے لئے)

رنگ و بو کی دنیا میں اب کہاں جواب اُن کا
عشق فرش بزم اُن کا حسن فرش خواب اُن کا

اوج پر جمال اُن کا جوش پر شباب اُن کا
عہد ماہتاب اُن کا دورِ آفتاب اُن کا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالم ترآب اُن کا

کہیے حال دل لیکن دیکھیے کن آنکھوں سے
ہر سکوں کے پردے میں حشر اضطراب اُن کا

یونہی کھولے جاتے ہیں حسن و عشق کے اسرار
اک نفس سوال اپنا اک نفس جواب اُن کا

اور کس کی یہ طاقت اور کس کی یہ جرأت!
عشق آپ آڑا اپنی حسن خود حجاب اُن کا

رنگ و بو کے پردے میں کون پھوٹ نکلا ہے
چھپ سکا چھپائے سے کیا کہیں شباب اُن کا

جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے
نیم وا سی آنکھوں میں اُف وہ کیف خواب اُن کا

عرض غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اونہہ" کہہ کر سن لیا جواب اُن کا

تو جگر سے مستوں پر طعن کر نہ اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اُن کا

حضرت ماہر القادری

دیکھنا! یہ کون بے پردہ نمایاں ہوگیا
ایک عالم بے نیازِ کفر و ایماں ہوگیا

آج اپنے کبر پر زاہد پشیماں ہوگیا — زہد نے اتنی ترقی کی کہ عصیاں ہوگیا
کھل ہی جانا ایک دن تیری مسیحائی کا راز — وہ تو یہ کہیے کہ غم کا نام درماں ہوگیا
بحرِ وحدت میں اٹھی تھی آج اک بیتاب موج — عالمِ کثرت میں جس کا نام انساں ہوگیا
ٹھوکروں ہی ٹھوکروں میں پاگئے منزل کو ہم — مشکلوں ہی مشکلوں میں کام آساں ہوگیا
پھر کوئی نکلا ہے گھر سے لے کے دنیائے شباب — پھر کسی کمبخت کے مٹنے کا ساماں ہوگیا
میں نے ماہرؔ آج کچھ اس دھن میں چھیڑا سازِ عشق — ذرہ ذرہ خاکِ ہستی کا غزلخواں ہوگیا

آغا حشر مرحوم کے دو غیر مطبوعہ شعر

آغا حشر مرحوم نے ایک خاص موقع پر یہ شعر ارشاد فرمائے تھے۔

جو خود کہتا ہے ہاں ہاں بیوفا ہوں بے مروت ہوں — اُسی ظالم سے مجھ کو پھر محبت ہوتی جاتی ہے
غضب ہے بھول کر بھی اب نہیں ملتی نظر تیری — یہ تجھ سے بھی زیادہ بے مروت ہوتی جاتی ہے

نواب جعفر علی خاں صاحب آثرؔ بی، اے لکھنوی

حسرؔ! ذرا اس کے بعد کا ساماں کئے ہوئے — بیٹھا ہوں دل کے داغ فروزاں کئے ہوئے
پھر دل ہے منتظر کسی یوسف جمال کا — آنکھوں کو فرطِ شوق میں زنداں کئے ہوئے
نظارہ ہے امیدِ تبسم میں گل بکف — دل کو فدائے جنبشِ مژگاں کئے ہوئے
ترکیب سوچتے رہے وہ اہتمام کی — زخمِ جگر پہ سایۂ مژگاں کئے ہوئے
صحرا نہیں ہے کوئی ہمارے مذاق کا — بیٹھے ہیں اپنے گھر کو بیاباں کئے ہوئے
بکنے چلا ہے عشق کے بازار میں وہ شوخ — عصمت کو اپنے حسن کا درباں کئے ہوئے
پہونچے گا تیرے در پہ اثرؔ ایک دن ضرور — آبادیٔ خیال کو ویراں کئے ہوئے

حضرت اظہار میرٹھی

نقابِ رخ پہ نہیں آنکھ میں حجاب نہیں — یہ اور کیا ہے اگر مستیٔ شراب نہیں

سنورئے شوق سے کچھ باعثِ حجاب نہیں — فریب آئینہ ہے آپ کا جواب نہیں
غضب یہ جلووں کا طوفان ای معاذ اللہ — کہ دل کو شوق ہے چشم ہوس کو تاب نہیں
تمہارا دیکھنا اک غم کا پیش خیمہ تھا — وہ نیند اُچٹی ہے اب تک مجالِ خواب نہیں
فریبِ عشق کی اللہ رے کارفرمائی — وہ غم دیئے ہیں کہ جنکا کوئی حساب نہیں
شبِ فراق بجز مرگ اور کیا ہوگا — سکوں نصیب نہیں تابِ اضطراب نہیں

حکیم زیبا صاحب فیض آبادی

یہ جو دل بے قرار ہے پیارے — عشق خود شرمسار ہے پیارے
تو جسے دیکھ لے نظر بھر کر — وہ مجسّم بہار ہے پیارے
اک نظر دیکھ لے ترے صدقے — دل بہت بیقرار ہے پیارے
غم جو تو نے عطا کیا اُس پر — ہر مسرّت نثار ہے پیارے
دل کی فطرت میں ہے تڑپ اُٹھنا — دِل پہ کب اختیار ہے پیارے
حُسن پہ اعتماد کیا معنی؟ — عشق پر اعتبار ہے پیارے
درد بخشا مجھے عفاک اللہ — درد ہی خوشگوار ہے پیارے
جلوۂ شوق و اہتمامِ نظر — تجھ پہ سب کچھ نثار ہے پیارے
ہر نظر میں ہے کیف و سرمستی — ہر نظر بادہ خوار ہے پیارے
نگۂ آشنا بنا دے اُسے — وہ جو بیگانہ وار ہے پیارے
اس میں تیری خطا نہ دل کا قصور — عشق خود فتنہ کار ہے پیارے
یہ جو دیوانہ سا ہے اک زیبا — تیرا ہی جاں نثار ہے پیارے

حضرت مرزا بیضا خاں مروی ایرانی

جانِ موردِ اضطراب تا کے — دل در تگ پیچ و تاب تا کے
از موت و حیات و حشر و عقبےٰ — بر گردنِ من عذاب تا کے

اے جائے تو بر سر و بچشمم — از عاشق خود حجاب تا کے
توبہ نہ کنم ز شاہدو مے — دائم کا آخر شباب تا کے
بیدار شو اے نصیب خفتہ — از خواب بہ خیز خواب تا کے
بیضا بہ بلائے غم گرفتار — یا حضرتِ بوتراب تا کے

حضرت فطرت واسطی بی، اے

جب شام کو حسن صبح کا عالم ایک فسانہ بنتا ہے
جب چاندنی کی ضو سے زیر سما پُر نور خزانہ بنتا ہے
جب شوخ ستارے ہنستے ہیں اور نور کی بارش ہوتی ہے
جب حسن کے سارے عالم میں آنکھوں سے پرستش ہوتی ہے
جب عیش کی موجیں ہستی کو جھولے میں جھلانے آتی ہیں
جب نیند کی پریاں دنیا کو چپکے سے سلانے آتی ہیں
کچھ نیند سی طاری ہوتی ہے میں کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں
معلوم نہیں اس عالم میں، میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں
احساس میں کچھ مدہوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
انفاس میں کچھ سرگوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
بجلی سی چمکتی ہوتی ہے، پُرنور نگاہیں ہوتی ہیں
جذبات میں جنبش ہوتی ہے مخمور نگاہیں ہوتی ہیں
تم میری نظر کے دامن میں انگڑائیاں لیکر سوتے ہو
تم سانس کہیں بھی لیتے ہو، محسوس مجھے تم ہوتے ہو

یارانِ میکدہ

کیف حالکا ——— ؟ سنا ہے کہ ڈاڑھی کے بعد آپنے ماشاء اللہ گیسو بھی چھوڑ دیئے ہیں! لیکن شاید آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ صوفیانہ ارتقا کی ایک منزل "ڈسٹرکٹ گزٹ" کی ایڈیٹری کا ترک بھی ہے۔ گستاخی تو ہوگی مگر کیا آپ کی مجذوبانہ بیخودی یہ راہِ سلوک گم کردہ راہوں پر بھی کھول سکتی ہے کہ "ڈاڑھی" اور "گیسو" چھوڑنے کے ساتھ ساتھ آپنے "نوکری" کیوں نہیں چھوڑی ——— !؟!

کیا اس لئے نہیں چھوڑی کہ "پیری مریدی" کے لئے اکا دکا سفید بالوں کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے اور ماشاء اللہ ابھی آپ کی ریشِ مبارک پہاڑی کوّے کو مات کر رہی ہے۔

——— جو کچھ بھی ہو مگر آپ کی "جوانمرگی" نے آپکے شیدائیوں کو سرتاپا "الفاتحہ" بنا دیا ہے۔

یاد شش بخیر "سرخیلِ رنداں" کی یہ مصیبت بھی کتنی دلچسپ، دیدنی اور قابلِ رحم ہے کہ "بت پرست" کے چنگل سے رہائی ملی تو "بت شکن" کے پنجے میں تھے اور "بت شکن" سے چھوٹے تو اپنے پنجۂ خودکش میں پھنس گئے! "بامن دیوتا" بزعم خود ترلوک کی ذمہ داری لئے ہوئے تھے اور ملا صاحب دوزخ و جنت کی، مگر انقلاب زندہ باد کہ "کلیم" کی ذمہ داری اب خود اپنی "برق وطور" پر ہے۔

بیک وقت عبودیت و معبودیت، اَرَنِی و لَن تَرَانِی کی کشاکش ہے۔

کہاں سرخیلِ رنداں اور کہاں یہ کشاکش، کہئے وی۔ پی فارم بھرنے میں وقت تو نہیں ہوتی؟

"یارانِ میکدہ" ہونے کی یہ شرط ہرگز نہیں کہ آپ زندہ رہیں اور لاپتہ، کوئی شک نہیں کہ

جوشؔ "کلیم" کی پیٹ اور آپ "شعلۂ طور" (؟) کی جھپیٹ میں ہیں —— مگر محض آپ ہی کچھ نہیں ساغر کو بھی بادۂ شیراز سے کچھ تعلق ہے —— !

واللہ جس دن ہم نے "ارنی" کہا وہ تمام حجابات پھونک کر خود نکل آئیں گے۔ اور ہم مسکرا کر آپ کی طرف اشارہ کر دیں گے —— اب تو مین پوری بلا لیجئے !؟

اُس گلچیں کے اثر کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو بمبئی میں بیٹھے بیٹھے دہلی کے چمنستان سے گلاب کو اس طرح توڑ لے گویا میز پر رکھا ہوا تھا۔ بہت اچھا ئین نے بھی اک "جلالی عمل" شروع کر دیا ہے۔ "ہینگنگ گارڈن" اور آپ کو کچھ دنوں میں نئی دہلی کی زینت ہوں گے، ورنہ خیریت اسی میں ہے کہ —— !

غزل کے استرادمیں جو مضمون کلیم میں شائع ہوا تھا وہ اتنا مسکت و مدلل تھا کہ آپکو نہ صرف خاموش کر گیا بلکہ بیمار بھی ڈال گیا۔ اگر آپ تنہائی میں اعتراف شکست کر لیں تو ہم آپکے اب بھی بتا سکتے ہیں کہ آپ کا "قاتل" آپکے دوستوں ہی میں سے ایک ہے، اور آپکی نگاہوں کے سامنے ہنستا بولتا اور آزاد چلتا پھرتا ہے !

اور اگر آپ ہم کو، کوئی بڑی رشوت دیں تو "ہمالو" کا بھی پتہ دیا جا سکتا ہے —— مگر یہ تو بتا دیجئے کہ آپ اب جامعہ والے اپنے مضمون پر ایمان تو نہیں رکھتے !؟

کچی نیند سے جگا کر آپ کا یہ کہنا کہ غازی آباد تک چلو، اور پھر میرٹھ اسٹیشن سے چپ چاپ گھر واپس آجانا۔ میرٹھ کو غازی آباد بنا دینے کے لئے کافی تھا —— اسی دن سے میرٹھ سٹی اسٹیشن کے در و دیوار پر "غازی آباد" لکھا دیکھا گیا۔ پڑھنے والوں نے کہیں کہیں یہ مصرع بھی پڑھا۔

عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا —— !؟

"س"

تمام عوام و خواص کی اطلاع کے لئے میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ "علی گڈھ پرنٹنگ پریس" دہلی کے مالک یا منیجر ضیاء الرحمٰن صاحب کی غلط بیانی سے متعلق کہ "کتاب بادۂ مشرق" مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ، علی گڈھ پرنٹنگ پریس میں طبع ہوئی ہے، ایک واضح اعلان کر کے پبلک کو یہ بتا دوں کہ علی گڈھ پرنٹنگ پریس دہلی کے مالک بادۂ مشرق گاہکوں کو دکھا کر کس طرح کام حاصل کرتے ہیں۔

اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ:۔

عالیجناب راؤ بہادر حاجی محمد عبد الحمید خاں صاحب منظر رئیس اعظم باغپت نے شیخ صاحب ساغر صاحب سے فرمایا کہ علی گڈھ پرنٹنگ پریس والوں نے ان سے یہ کہا کہ بادۂ مشرق ہمارے پریس میں چھپا ہے، اور اس بنا پر انھوں نے اپنی کتاب "آفتاب رسالت" علی گڈھ پرنٹنگ پریس میں طبع ہونے کے لئے دیدی۔

لیکن محض اس لئے کہ ضیاء الرحمٰن خاں شروانی میرے ہم وطن ہیں اور ان کی یہ حرکت نازیبا، انتقام کے بجائے رحم کی حقدار ہے۔ اس لئے میں ہر خیال سے درگذر کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ مسئلۂ حقیقت یہ ہے کہ بادۂ مشرق صفحہ نمبر ۱ سے لے کر صفحہ ۱۴۴ تک تمام و کمال (جس میں اس کے پس ماندہ منظر بھی شامل ہیں) ساغر پریس میرٹھ ہی میں طبع ہوئی ہے۔

اس لئے ضیاء الرحمٰن خاں یا جو کہیں ہندوستان کا جو مطبع بادۂ مشرق دکھا کر گاہکوں سے کام حاصل کرتا ہے غلط بیان، بدمعاملہ اور بے حس بیوپاری کا مجرم ہے اور پبلک کو ایسے شخص سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

جو صاحب "بادۂ مشرق" جیسی شاہکار کتاب چھپوانا چاہیں وہ براہ راست ساغر پریس میرٹھ سے خط و کتابت کریں یا خود میرٹھ تشریف لائیں جہاں کتاب نے کو خود ساغر صاحب کی ڈائرکشن میں مکمل طور پر طبع ہو تیار ہوئی ہے۔ دعویٰ نہیں لیکن بہ ادب گذارش ہے کہ بادۂ مشرق کی طباعت کے کمال کا ریکارڈ اگر کوئی توڑ سکتا ہے تو یقین فرمایئے کہ اس نیلگوں آسمان کے نیچے صرف ایک پریس ہے اور وہ صرف ساغر پریس میرٹھ۔

خاکسار　احدیار خان　(منیجر)

مشتہرین کیلئے بہترین موقع

رسالہ پیمانہ سے کوئی شہر اور کوئی قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے پندرہ بیس خریدار نہ ہوں۔ اگر آپ اپنی تجارت کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو رسالہ "پیمانہ" میں اپنا تجارتی اشتہار دیجئے۔ پیمانہ کی اشاعت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی اس کے مستقل خریدار موجود ہیں، اس میں اشتہار دینے کے بعد آپ کو خود حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

نرخ نامہ حسب ذیل ہے

مدت	پورا صفحہ	نصف صفحہ	¼ کالم
ایک سال	عنـ۲؍	[illegible]	[illegible]
۶ مہینہ	عنـ۱	[illegible]	ـــے؍
۳ مہینے	صہ	ـــے	[illegible]
ایک بار	[illegible]	[illegible]	۱۲؍

نوٹ، اشتہار کی اجرت بذریعہ منی آرڈر پیشگی آنی چاہئے، ورنہ اشتہار درج نہ ہوگا۔ منیجر پیمانہ ادبی مرکز میرٹھ

رنگینیاں جو حُسنِ ازل کی تھیں جابجا
وہ کھنچ کے آگئیں نگہہِ انتخاب میں

کتاب مجموعۂ کلام شعرائے قدیم، غالب، ذوق، مومن، میر، ولی، امیر، داغ وشعرائے جدید سیاب، ساغر، جوش، فانی، جگر، چھپ کر تیار ہو گیا ہے جس میں ہر شعر منتخب اور ہر کلام دلآویز ہے۔ کلام کا انتخاب اس معیار پر کیا گیا ہے کہ ہر شعر گویا ایک دیوان کا حکم رکھتا ہے اور ضرب المثل کہلائے جانے کے قابل ہے۔ ہر اُردو داں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری اور مفید ہے۔ قیمت صرف ۸؍ رکھی گئی ہے۔

پتہ

(۱) کتب خانہ رشیدیہ دہلی
(۲) حبیب گنج بھیکم پور ضلع علیگڈھ

ڈیفر
(رجسٹرڈ)

کان کی جملہ تکالیف، مثلاً درد، زخم، ورم، کھجلی، بھنسی، بہنا بند رہنا، ناسور پڑ جانا، سہھاری رہنا اور عرصہ کے بہرہ پن کے لئے اکسیر کا حکم رکھنے والی نہایت زود اثر، مجرب اور بہترین دوا ہے جس کے چند روز کے استعمال سے ہزارہا مریض شفایاب ہو چکے ہیں۔

قیمت فی شیشی صرف آٹھ آنے، محصولڈاک ۵؍ چار شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصولڈاک معاف

ملنے کا پتہ ڈیفر فارمیسی ۳۰ نیا بازار شہر میرٹھ

بادۂ کہن

پیمانہ کے گذشتہ منتشر نمبر ایک جلد کی صورت میں

دور اوّل پہلی جلد سائز $\frac{26 \times 20}{16}$		مع محصول ڈاک	محض ایکروپیہ
دور ثانی دوسری جلد $\frac{27 \times 17}{4}$	(بادہ مشرق سائز)	"	محض بارہ آنے ۱۲/
دور ثالث تیسری جلد $\frac{30 \times 20}{8}$	(نگار سائز)	"	محض ایکروپیہ آٹھ آنے

ہر جلد بادۂ کہن کے نام سے جدید سرورق سے آراستہ کرکے مرتّب کی گئی ہے، اور دفتر "پیمانہ" "ادبی مرکز میرٹھ" سے ملتی ہے، مندرجہ بالا قیمتیں نمبروں کی اصل قیمت سے ½ مقرر کی گئی ہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والوں تک یہ تحفہ پہونچ جائے اور اس سے جو کچھ حاصل ہو وہ موجودہ پیمانہ پر صرف کردیا جائے اتنی کم قیمت میں ایسی مجلّدات مل جانا ایک حسن اتفاق ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

منیجر

مکتبہ ساغر "ادبی مرکز" میرٹھ

(جوانی کے موضوع پر اردو شاعری میں سب سے عجیب اور جدید کتاب)

سنہ ۱۹۲۵ء میں "شبابیات" کے عنوان سے ساغر نظامی کی ۴۶ رباعیاں شائع ہوئی تھیں، اب گیارہ برس کے بعد اُس کا دوسرا ایڈیشن "سرودِ شباب" کے نام سے کافی ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اپنی نئی ترکیب کی بنا پر یہ بجائے خود ایک نئی تصنیف ہے۔ شبابیات میں محض شاعر اپنے شباب کا مغنّی تھا لیکن گیارہ برس میں شعور نے سینکڑوں منزلیں طے کیں اور وہ اس منزل پر آپہونچا جہاں خود فریبی، خود نگری، خود پرستی، بیخودی اور خود ستائی حسن کی مدّاحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے حصے میں شاعر اپنی جوانی کے گیت پوری سرمستی سے گاتا ہے اور دوسرے حصہ میں حسن کا نغمہ گر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کتاب "بادۂ مشرق" سائز پر چھاپی گئی ہے اور ہر رباعی کی تصویر پس منظر (Back ground) میں دی گئی ہے اس التزام نے کتاب کو جوانی کا طلسم زار بنا دیا ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ اور کتابت اعلیٰ ترین ہے۔ چھپائی میں "ساغر پریس" نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ جلد بندی کے بجائے کتاب کو ریشمیں فیتہ سے باندھا گیا ہے ٹائیٹل رنگین، بلاک کا ہے اور آرٹ کا بہترین نمونہ۔ قیمت عہ، علاوہ محصول

پرنٹر و پبلشر اسد یار خان صہبائی نے "ساغر پریس" میں چھپوا کر ادبی مرکز میرٹھ سے شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر

زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ دار

دوشینہ شکستیم بیک توبہ دو صد جام
امروز بیک جام دو صد توبہ شکستیم

پیمانہ

زیرِ نظر
ساغر نظامی

مُدیر صہبا

ادبی مرکز میرٹھ

ساغر نظامی کا مکمل مجموعۂ نظم و غزل

بادۂ مشرق

قیمت عہ فی جلد سائز ۲۷×۱۷/۸ جلد آرٹ کا اعلیٰ نمونہ مضبوط و حسین، کاغذ بہترین ۳۲ پونڈ حجم ۶۴۰ صفحات

محترمہ جہاں آرا بیگم شاہنواز ایم، ایل، اے کی رائے

"ساغر نظامی ہمارے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو ہمیں مستقبل کا اُمید افزا پیغام دیتے ہمارا قومی ادب پستی اور یاس کی گہرائیوں میں گر چکا تھا، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان ادیب اسے امید و اتحاد کی بلندیوں کی طرف لئے جاتے ہیں، ہمارے ملک و قوم کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے ایسے شاعروں کا وجود ایک قومی کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ جو قوم کے افراد کو یگانگت، انسانی ہمدردی اور فطری توانائی کا سبق دیں۔ ساغر صاحب ایک ایسے شاعر ہیں۔ اِن کے پڑھنے کا انداز سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اِن کی نظمیں انھیں سے سُننی چاہئیں۔ سُننے والے پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا اثر مدت تک قائم رہتا ہے۔

میں نے فرصت کے اوقات میں اُن کا دیوان بادۂ مشرق پڑھا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ لاجواب کتاب پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔ اِس کی ظاہری و معنوی خوبیاں یکساں ہیں۔ جا بجا خوبصورتی اور رنگینی نے ظاہری اور معنوی حیثیت نے ایک اَدبی گلزار کی صورت پیدا کر دی ہے۔ بادۂ مشرق ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہونا چاہیے۔"

جہاں آرا شاہنواز از لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۷ء

حضرت اشرف نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث

قیمت سالانہ محض ۱۲ ششماہی ۱۲

تعارف

تصویر:- حضرت اشرف امیر الامرا النوّاب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث رئیس اعظم حیدرآباد (دکن)

جلد ۱ | پیمانہ :- اگست ۱۹۳۷ء ادبی مرکز میرٹھ | نمبر ۲

میخانۂ ادب میں پیمانہ کا خیر مقدم

ہفتہ وار تیج دہلی
۱۳؍ جولائی ۱۹۳۷ء

بہت دنوں کی بات نہیں کہ ہندوستان کا مشہور علمی و ادبی رسالہ "پیمانہ" شائع ہوا کرتا تھا۔ اکبر آباد میں اس نے اپنی زندگی کے چار دور گزارے اور اب اس کی اشاعت کا پانچواں دور میرٹھ سے جناب ساغر کی زیرِ نگرانی شروع ہوا ہے۔ اس کا پہلا پرچہ ہمارے پاس ریویو کے لئے آیا ہے۔ جو گوناگوں خوبیوں سے لبریز ہے، اور یقیناً زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ دار ہے۔ نثر کا پہلا مضمون "وکٹر ہوگیو" کے ایک شاہکار "محبت" کا ترجمہ ہے اور پہلی نظم "صبر کر" کے عنوان سے حضرت جوش ملیح آبادی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ باقی مضامین بھی بلند پایہ اور قابلِ داد ہیں۔ رسالہ کی ترتیب بہت اچھی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ساغر کی نگرانی میں "پیمانہ کا یہ پانچواں دور بھی بہت کامیاب ہوگا۔ یہ چند سطریں تعارف کے طور پر لکھدی گئی ہیں۔ مفصل ریویو ہم کسی آئندہ اشاعت میں درج کریں گے۔

جامِ صہبا

دیکھ کر مجھ کو مسکرا بھی دے — دولتِ دلبری لُٹا بھی دے
دردِ دل مجھ کو بخشنے والے — دردِ دل کی مجھے دوا بھی دے
غم دیا ہے تو او ستم پرور — فرصتِ دردِ آشنا بھی دے
رحم فرما مری نگاہوں پر — بجلیوں کا نقاب اُٹھا بھی دے
پار طوفاں سے ہو سفینہ ابھی — کچھ سہارا جو ناخدا بھی دے
طرحِ توحیدِ عاشقی فرما — درمیاں سے حجاب اٹھا بھی دے

گو نہیں ظرفِ عشق صہبا میں
جام ہلکا سا اک پلا بھی دے

"ایڈیٹر"

جرعات

―――― * ――――

هر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پیمانہ کے پہلے ہی دور نے ادبی دنیا میں زندگی کی نئی سرمستی پیدا کردی اور میخانۂ ادب میں جس مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا وہ نہ صرف اس کے بادۂ ادب کے کیف آور ہونے کا ثبوت ہی بلکہ خمستانِ ادب اور بادہ کشانِ صناعت (آرٹ) کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی ہے۔

صحرا سے فضائے گلستاں تک مستی　　ہے آج زمیں سے آسماں تک مستی
وہ جامِ خرد سوز دے اے جانِ حیات　　چھا جائے مکاں سے لامکاں تک مستی

――――

اور حقیقت یہ ہے کہ پہلا جام جس بیتابی اور بے صبری سے ڈھالا جاتا ہے کچھ اسی نوعیت سے پیمانہ کے پہلے نمبر کی ترتیب ہوئی۔ مگر یہ نمبر نتیجہ ہے قدرے سرور کا اسلئے میکشوں کے حسنِ طلب کے ظرف و ذوق کے لحاظ سے شراب زنگار رنگ سے لبریز ہے۔ لیکن گدائے میکدہ کے پیش یقین بہ فضلِ ساقی "ہر طرح" کی موجود ہے اور سیری کا یہ عالم ہے کہ ؎

"جتنی پی لی ہو ابھی اتنی ہی پیمانے میں ہے"

――――

ہر کام کے لئے ایک مناسب شبھ گھڑی ہوتی ہے سو میری ایماندارانہ (بے ایمانی کا میخانہ میں امکان نہیں ہے) رائے ہے کہ سنہ ۱۹۲۷ء پیمانہ کے آغاز کے لئے شبھ گھڑی نہ تھی یہ وہ موسم تھا کہ خود ساقی تاب ہوش سے محروم اور پیمانہ کیف و کم سے عاری تھا۔

پینے پلانے کا موسم تو اب آیا ہے کہ "نشے سے ہے کل سوادِ اعظم بیخود" اور اس بیخودی میں خودی کا وہ جوش ہے کہ ہر لغزش بجائے خود اعتماد ہے۔ ساغر کی "خامکاری" پختہ کیفی کی ضامن ہو اور بیخودی اپنا آپ اہتمام ―― !

اللہ اللہ یہ میکدے کا نظام
مقتدی ہے کوئی نہ کوئی امام

اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر دَور اپنے دَورِ ماقبل سے کیف و مستی میں کسی طرح بھی کم ثابت ہوگا بنام ساقی دورِ پیمانہ کا آغاز ہوا ہے تو کیا ممکن ہے کہ ہر پیمانہ کچھ ہی دنوں میں بجائے خود "میخانہ" نہ بن جائے اور رندانِ بادہ خوار سرشار ہو کر چیخ نہ اٹھیں ؎

کب تک آخر جرعہ جرعہ قطرہ قطرہ ساقیا　　لا اُلٹ لیں آج پیمانہ میں کُل میخانہ ہم

لِلّٰہ الحمد، یہ بزمِ میکدہ "کوئی کم خور" بادہ کشوں کی انجمن تو ہے نہیں یہاں تو جو ہے "معیاری" ہے - ایک طرف جوشؔ و جگرؔ، اخترؔ و آزادؔ ہیں تو دوسری طرف اختر و حفیظؔ، فطرتؔ و اثرؔ ہیں اِدھر بشیرؔ و یحییٰؔ ہیں تو اُدھر مخمورؔ و نیازؔ، نگہ اٹھائیے تو ساقی جام بدست ـــ نظر بچائیے تو بادہ کش سچ پوچھیے تو امتیازِ "ساقی و مے کش" کہاں ؟ ایک دوسرے کو اپنا ہوش نہیں، میکدے کے سورج کا کیا ذکر، میخانے کے سوئے اور دبے ہوئے ذرّے پکار رہے ہیں

میرے حالات پر نہ جا ساقی　　ہاں پلا جامِ مے پلا ساقی
ارتقا گر ہے انتہائے زوال　　ہے تنزل بھی ارتقا ساقی

اس عالم سے جو دُور ہے اُس کو اپنی بدبختی کے "رجسٹرڈ" ہو جانے کا یقین کر لینا چاہیے۔ اور جو منکر ہے وہ ـــــــــــــــــــــــ!

ـــــ ! سعادت کچھ اسی میں ہے کہ سرِ شام درِ میخانہ پر صدا دی جائے !

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

سنعل

تاریخ کی لغزشیں

(سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

تاریخ جہاں ماضی کے تجربات سے حال پر اثر ڈالتی ہے اور مستقبل کے لئے بہتری کا سامان فراہم کرتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اِس کے مغالطے قوموں میں تصادم و نفرت کے محرک بھی بن جاتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ دنیا "تاریخ" کے صفحات میں ضمیرِ انسانی کے نشوو ارتقا اور مدارج آزادی کو تلاش کرنے کے بجائے قومی عظمت و برتری کے افسانوں کو ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ مورّخ کا قلم پیدائشی ماحول اور عقائد و نیز قومی سیاسیات کی مصلحتوں سے مبرّا ہو کر حقیقت نگاری اور صحیح تحقیق کا توازن بہت کم قائم رکھ سکا ہے۔ اور اگر آج ہم انسانی برادری کے صدہا تنازعات کے اسباب کی چھان بین کرنے بیٹھ جائیں تو کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے جو مصلحت طراز دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ثابت ہوں گے اور حقیقت سے انھیں دُور کا بھی تعلق نہ ہوگا۔ علم الاجتماع کے بانیٔ اوّل علامہ ابنِ خلدون نے اسی ناجائز آمیزش کو دور کرنے کے لئے مجبوراً یہ قاعدہ مرتب کیا کہ جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا، اتنی ہی زیادہ افسانہ سرائی اِسے اپنے حصارِ تخیّل میں لے لیگی۔ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اِس رمز کو زیادہ لطیف

پیرایہ میں اس طرح ادا کرتا ہے کہ "انسانی عظمت کی انتہا یہ ہے کہ افسانہ بن جائے"

ہندوستان کی تاریخ اس قسم کے تاریخی شبہوں سے بھری پڑی ہے اور اگر کچھ محتاط تاریخی شہادتوں کو جمع کیا جائے تو شاید ایسی تاریخ پیدا ہو جس کی روشنی میں وہ بہت سے تنازعات خود بخود نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی سرزمین متضاد جذبات میں تقسیم ہو چکی ہے، ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ تصویر کا ایک رخ ہے اور چونکہ طلباء میں تحقیق کا مادہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کی تعلیم کا اصل منشا صرف چند درسی کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ حقیقت سے بےخبر رہتے ہیں اور غلط معلومات کے زہریلے جراثیم لے کر جب وہ میدان عمل میں آتے ہیں تو باہمی اختلاف کی خلیج کو وسیع تر کرنے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جب ہندوستانی طالب علم تاریخ کے مطالعے میں مصروف ہوتا ہے تو بصیرت اور صحیح قوتِ فیصلہ اس کی رہنمائی نہیں کرتے، عقائد ذاتی کے دبیز حجابات اس کی دماغی اور تنقیدی قوتوں کو بیدار ہونے سے روکتے ہیں، قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے وقت ایک مسلمان طالب علم کا زاویۂ نگاہ تلاش حق سے اتنا ہی دور ہوتا ہے جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی، وہ پراچین تہذیب میں بت گری اور اصنام پرستی کے سوا کوئی چیز نہیں دیکھتا، اس کی متعصب نگاہ ان خوبیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے جو ہندوستان کے شاندار ماضی میں پنہاں ہیں، وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ جب کرۂ ارض کا بڑا حصہ درختوں کے پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے اپنی عریانی کو ڈھانپتا تھا اُس وقت ہندوستان تمدن کی کتنی بلندی پر پہونچ چکا تھا، اگر قدیم ہندوستان پر مبصرانہ نظر ڈالی جائے تو یہاں آپ کو ہر قسم کی چیز نظر آئے گی، جمہوریتیں، بادشاہتیں، شاہنشاہیاں، فلسفے، الٰہیات، یوگ، سیاسیات، نظام حکومت، سائنس، فنون، مذہب، شعر و سخن ہر قسم کی یادگاریں، محلات، منادر، عالیشان عمارتیں، سوسائٹیاں، روحانی علوم، دنیاوی فنون، ضابطے، رسم و رواج، تجارتیں، صنعتیں غرضیکہ ایک لامتناہی فہرست ہے۔ اور ہر شعبہ میں سرگرمیِ عمل فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے اس دور میں آپ دیکھیں گے کہ یہ ملک ہر چیز پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی قوت تخلیق نہیں

تھکتی۔ ایک پل کے لئے دم نہیں لیتا اور نہ بیکار ہوکر بیٹھتا ہے اس کی وسعت جغرافیائی حدود کو چیر کر دوسرے ملکوں تک پھیل جاتی ہے اس کے جہاز سمندروں کو عبور کرتے ہیں اور اس کی دولت کی فراوانی مصراور روم کے ساحلوں سے مکراکران کے خزانوں کو معمور کرتی ہے اس کی نوآبادیاں مشرق الجزائر میں قائم ہوتی ہیں اور اپنے فنون اور منظومات رزمیہ سے انھیں مالامال کردیتی ہیں۔ اس کا مذہب چین اور جاپان کو فتح کرلیتا ہے، اپنشدوں کے اصول اور بدھ مت کی تعلیمات کی بازگشت مسیح کے ہونٹوں سے سنائی دیتی ہے، ہر جگہ کیا زراعت اور کیا علوم وفنون، زندگی کی قوت نظر آتی ہے۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھیے کیا مسلم طالب علم ان تمام حقائق کو دیکھنا اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے؟

ٹھیک اسی طرح ایک ہندو طالب علم کی بے بصری بھی کچھ کم اندوہناک نہیں، آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر جبکہ محمد ابن قاسم نے سندھ کے ریگستانوں پر یورش کی تھی، ۵۷ء کے غدر تک اس حقیقت فراموش طالب علم کو اسلامی مظالم اور استبداد کے سوا اس ایک ہزار سال کی تاریخ میں اور کوئی داستان نہیں ملتی وہ صرف جنگ وجدل اور اسلامی فتوحات کی خونچکاں داستان کو دہراتا رہتا ہے اور صرف یہی ایک کہانی اس کے حافظے کے لئے مخصوص ہوچکی ہے۔ اسلامی کلچر اور تمدن نے ہندوستان کو جن نئی چیزوں سے روشناس کیا اور اتحاد تہذیب سے جس نئے کلچر کی تخلیق ہوئی اس سے وہ یکسر غافل اور بے خبر ہی نہیں بلکہ اس کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی اس کے دماغ اور دل میں گنجائش تک نہیں، کتنے ہندو طلبا، اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ اورنگ زیب جس کے نام سے ان کی پیشانی سمٹ جاتی ہے اور جس کے تعصب اور تنگ دلی کی داستان ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر چکی ہے اتنا ہیبت ناک نہ تھا جس قدر عام مورخین نے اس کا خوفناک خاکہ پیش کیا ہے۔ انگریز مورخ انفلٹن لکھتا ہے۔

"کسی جگہ اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ مذہب کی وجہ سے کسی ایک بھی ہندو کو سزائے موت یا قید سے دوچار ہونا پڑا ہو یا اس کے مال وزر پر محصول عائد کیا گیا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانہ میں کسی ایک فرد کو بھی اپنے باپ دادا کے طریقے کے مطابق علانیہ عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہو۔"

اور مسلم بادشاہ شیر شاہ سوری کے متعلق ایک یورپین مورخ کی تحقیقات ہے کہ "شیر شاہ

ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنت ہند کو منشائے عوام کے مطابق قائم کیا۔ کسی حکومت نے حتیٰ کہ حکومت برطانیہ نے بھی اتنی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا جتنا کہ اس پٹھان نے۔"

سر پی، سی، رے جن کی تاریخی حیثیت بہت بلند ہے، قوی شہادتوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "ہندوستان میں ترقی اسلام کی تاریخ، ہندو مسلم آمیزش کی تاریخ ہے"۔ ۔ ۔ ہندو مسلم اتحاد، ان دو بڑی نسلوں کے خیالات، جذبات اور روایات کا ارتباط صرف سیاست تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ یہ معاشرتی تعمیر کے اندرونی گوشوں تک پہونچ گیا تھا جس کا نتیجہ وہ تحریکات ہیں جو معاشرتی اور مذہبی رنگ میں رونما ہوئیں۔ ۔ ۔ ۔ گرونانک، کبیر اور چیتنیہ ان دونوں کلچروں کی آمیزش کا ہی ثمر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام کی جمہوری اسپرٹ نے ذات پات کے قدیم قبیح سسٹم کو توڑنے اور خود ہندو سماج میں رواداری اور بلند خیالی کی روح پھونکنے میں بڑا صالح اثر ڈالا ہے۔ علوم و فنون کے سلسلے میں زیادہ کہنا بیکار ہے۔ یونانی دماغ کا جوہر گراں مایہ انھیں مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ہندوستان میں پہونچا۔ فتحپور سیکری اور تاج کا معمار انصافاً خواہ مخواہ بھیڑئے کے نام سے پکارے جانے کا ہرگز مستحق نہیں ہو سکتا۔ فنون لطیفہ کی کوئی بھی ایک شاخ ایسی نہیں ملے گی جو اسلامی حکمرانوں کی ممنون احسان نہ ہو۔ بلکہ صدہا تاریخی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رائج الوقت تاریخ نے ہندوستان کی صحیح تاریخ پیش کرنے میں مجرمانہ کوتاہی کی ہے۔ یہ چونکہ ایک مختصر مقالہ ہے اس لئے شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

ماحصل یہ ہے کہ ہندوستانی طالب علم آزاد دماغی سرگرمی سے بے بہرہ ہے۔ مرتب اور نقاد دماغ اور شعور تحقیق پر غنودگی طاری ہو گئی ہے۔ ذہنی ارتقا، مشاہدہ اور تحقیق کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی کی مسرتیں بھی ختم ہو گئیں اور بعض ایسے فتنے کھڑے ہو گئے ہیں جو اجتماعی زندگی کے لئے سم قاتل ہیں، اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دماغی اور تنقیدی قوت بیدار ہو، خیالات میں اتنی آزادی اور لچک پیدا ہو جائے کہ مذہبی رجعت پسندی یا نسلی تعصب تلاش حق اور تفہیم حق میں سدِ راہ نہ ہو سکیں، جس قوم کے طلبا حق و باطل میں امتیاز کرنے کے خوگر نہ ہوں وہ کبھی اپنی پوری بلندی کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی۔ غلط تاریخ ہماری

تمام نامرادیوں کا سرچشمہ ہے لیکن صحیح تاریخ ان نامرادیوں کو دور کر سکتی ہے۔ ہماری موجودہ علمی زندگی محض ادبی اور جذباتی ہو۔ گہری نہیں۔

ہمیں ایک ایسی نئی زندگی کی ضرورت ہے جو سوشل خیالات میں وسعت پیدا کرے اور قوم کو اس تمدن سے آشنا کرے جو گہرا اور حقائق پر مبنی ہو۔

آس کی چنگاری

اٹھا یہ کون ساغر و مینا لئے ہوئے
مستانہ لغزشوں کا سہارا لئے ہوئے

نکلے ہیں تیری بزم سے ہم کیا لئے ہوئے
(ق) احساسِ صد شکستِ تمنا لئے ہوئے

سینے میں ایک کشمکشِ مرگ و زندگی
دل میں توہمات کی دنیا لئے ہوئے

اک دوش پر لئے ہوئے تابوتِ آرزو
اک دوش پر وفا کا جنازا لئے ہوئے

الزام کیوں ہے چشم تماشائے شوق پر
جلوے ہیں خود پیامِ تمنا لئے ہوئے

آخر جنوں کا بھید ستاروں پہ کھل گیا
ذرّے چمک اٹھے غمِ صحرا لئے ہوئے

اب نازِ عاشقی کو ہے اس دن کا انتظار
وہ آئیں میرے در پہ تمنا لئے ہوئے

پھر دل ہے اور بہاریں لٹنے کی آرزو
نوخیز بال و پر ہیں تقاضا لئے ہوئے

حدِّ تعیّنات سے کوسوں نکل گئے
میں اُن کا اور وہ مرا سہارا لئے ہوئے

ساغر حدودِ عشرت و غم سے گذر گیا
ساقی کی اک نظر کا سہارا لئے ہوئے

ساغر نظامی
۱۹۳۷ء

چمپا

(رومانی وجودیت کی آئینہ دار ہندوستانی زبان کی ایک نظم)

مجھے دن رات مصروفِ عمل پاتی ہو اے چمپا
تو تم یہ دیکھ کر سکتہ میں رہ جاتی ہو اے چمپا
کہ شاید میں تمھیں اس غم میں دل ہی سے بھلا بیٹھا
عروسِ مادّی کے گیسوؤں میں دل پھنسا بیٹھا
مگر یہ جہد مضرابِ ربابِ کامیابی ہے
عمل دیباچۂ بابِ کتابِ کامیابی ہے ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مصروف ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بےچین ہوں چمپا!

——— ؟

مری چمپا میں کیوں بےچین اور بیتاب رہتا ہوں
میں کیوں مضطر مثالِ پیکرِ سیماب رہتا ہوں
میں شعلہ سا بھڑکتا ہوں خیالوں ہی خیالوں میں
ہر اک شے پر تڑپتا ہوں خیالوں ہی خیالوں میں
مسلسل حملۂ رنج والم کیوں ہے مری چمپا!
بہارِ زندگی یوں نذرِ غم کیوں ہے مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بےچین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگین ہوں چمپا!

——— ؟

یہ تاروں کے کٹوروں میں شرابِ نور اے چمپا

یہ پیپل کے درختوں پر شبابِ نور اے چمپا!
شبابِ نور سے ہر گام پر اک طور اے چمپا!
یہ خاموشی یہ موسیقی قریب و دور اے چمپا!
مگر تو اس بہشت زندگی سے دور ہے چمپا!
طلسمِ مذہب و اخلاق میں محصور ہے چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغرور ہوں چمپا!
——— ؟

تبسم نے ترے تاجِ حیاتِ جاوداں بخشا
مری ہستیٔ فانی کو ثباتِ جاوداں بخشا
زباں بخشی بیاں بخشا نظر بخشی اثر بخشا
مرقص روح بخشی اور قلب نغمہ گر بخشا
ذرا اٹھلا کے جمنا پر خراماں ہو مری چمپا!
کنول کی پنکھڑی پر آج رقصاں ہو مری چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغرور ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدمست ہوں چمپا!
——— ؟

وہ تیرے کندنی ماتھے پہ رنگیں چاند سا ٹیکا،
جڑا ہو آئینے میں جس طرح یاقوت کا ٹکڑا،
وہ رنگیں چوڑیوں کے گیت وہ باہوں کا دو تارا
وہ مے نوشی وہ دل کی دھڑکنیں وہ مست سناٹا
وہ ساون کی جھڑی وہ جھینگروں کے راگ اے چمپا
مرے سینے پہ لہراتے ہوئے دو ناگ اے چمپا! ——— مری چمپا

تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدمست ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا!

؟

مری چپ ایک گہرا راز ہے اسرارِ الفت کا
زباں سے کچھ نہیں کہتا تو گویا کچھ نہیں کہتا
میں چپ ہوں اور چپ رہنا محبت کی شرافت ہے
خموشی مذہبِ الفت میں عاشق کی عبادت ہے،

مری چپ بربطِ خاموشِ الفت ہے مری چمپا
یہ بربطِ زمینیت آغوشِ قدرت ہے مری چمپا! —— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا

؟

جو میں بولا تو ایوانِ مذاہب گونج اٹھے گا،
لرز جائے گا کعبہ کانپ اٹھے گی دیر کی دنیا
چھڑے گا اک مہیب انداز سے ناقوس کا نغما
اٹھے گا شور بحر و بر سے اک اللہ اکبر کا

مری یہ مستقل چپ ایک گہرا راز ہے چمپا!
خموشی جذبۂ خاموش کی آواز ہے چمپا! —— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں چمپا!

؟

یہ مذہب ہے جو دل کے ساغروں کو چور کرتا ہے
یہ مذہب ہے جو ہر نزدیک شے کو دور کرتا ہے
تجھے غمگین کرتا ہے مجھے رنجور کرتا ہے

ہماری روح کو ہر گام پر مجبور کرتا ہے
مری صابر محبت میرا مذہب ہے مری چمپا!
یہی رنگیں حقیقت میرا مذہب ہے مری چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مجبور ہوں چمپا!

———"؟"

اگر بے صبر ہو جاؤں، اگر آزاد ہو جاؤں
تو قلعے مذہب و اخلاق کے اک آن میں ڈھاؤں
زمینوں کو ہلا دوں اور پھینکوں آسمانوں پر
اُٹھا لوں جوش میں ترلوک کو کمزور شانوں پر
مگر تیرا خیال آ کے مجھ کو روک دیتا ہے
بہکتا ہوں تو استادِ محبت ٹوک دیتا ہے ——— مری چمپا!

"؟"

خدائے حُسن کو دُعا مانگتے دیکھ کر!

اس طرح وہ خاموش دعا مانگ رہے ہیں
گویا کوئی گم کردہ ادا مانگ رہے ہیں
خود خالقِ صد حسن و ادا ہو کے وہ مخزوں
اللہ سے کیا جانیئے کیا مانگ رہے ہیں

اصغر مخزوں

دیوانگی

یہ واقعہ ہے کہ خواہ دنیا بھر کے ڈاکٹر اور حکیم اس چیز کو ایک خوفناک بیماری کہتے کہتے اسی میں مبتلا ہو جائیں لیکن میں اور میرے ہم وطن شعراء اسے ایک عطیۂ قدرت ہی سمجھتے رہیں گے۔ یقین نہ آئے تو ہم میں سے کسی ایک کی غزل اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ کوئی مجنوں کی دیوانگی پر رشک کر رہا ہوگا اور کوئی فرہاد کی وحشت پر فخر، کوئی اپنے آپ کو دیوانہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہوگا اور کوئی خلل دماغ کی ایک ایک علامت اپنے اندر گنا کر رکھ دیگا، یہ دوسری بات ہے کہ ہم لوگ بجائے آگرہ اور بریلی کے مخصوص مہمان خانوں کے بازاروں میں چلتے پھرتے، دفتروں میں کام کرتے، اور مشاعروں میں عجیب عجیب سُر نکالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عطیۂ قدرت کی مختلف قسمیں اور درجات ہیں۔ اگر انھیں گاؤدُم طریقہ پر لکھا جائے تو ترتیب یہ قرار پائے گی۔

بیوقوفی، حماقت، چغدپن، خبط، مراق، سنک، پاگل پن، وحشت اور جنون۔ آیئے ان کی ماہیت پر علیحدہ علیحدہ غور کریں۔

بیوقوفی:- یہ چیز بہت عام ہے اور ذرا سی غلطی پر خواہ وہ ٹنکچر آئیڈین اور جوارش جالینوس کے صحیح ہجے بھی نہ جانتا ہو فوراً دوسرے کے لئے تشخیص کر دیتا ہے۔

حماقت:- بیوقوفی کی بڑی بہن ہے اور اس سے ایک بڑی حد تک مشابہ، فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ بیوقوفی کا اُس ہستی پر اطلاق ہوتا ہے جس میں عقل کی کمی ہو اور حماقت کا اُس پر جس میں عقل تو ہو لیکن کسی قدر معطل،

چغدپن:- بھی ان دونوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ اگر حماقت میں تھوڑا سا بیہودہ پن اور شامل کر دیا جائے تو وہ چغدپن ہو جائے گا۔ جس شخص کو خوش قسمتی سے چغدپن حاصل ہو جائے وہ جانوروں سے زیادہ مشابہ

ہو جاتا ہے۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُس کے سر پر سینگ دکھائی دینے لگتے ہیں یا پیروں میں پانچ اُنگلیوں کی جگہ ایک سم، بلکہ اُس کی سیرت انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے ملنے لگتی ہے اور آپ اُس کی ہر حرکت پر چھوٹتے ہی کہہ دیتے ہیں۔ اُلّو۔ گدھا۔ مہربانی فرما کر اِس پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہ کیجیے کہ آخر کسی چغد قسم کے انسان کو اُلّو یا گدھا ہی کیوں کہا جاتا ہے۔ بلی کیوں نہیں کہہ دیتے۔ کبوتر فرما دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ حالانکہ اُلّو اور گدھا دونوں صاحبان اپنی فیلسوفیت اور عقل و دانش کے لحاظ سے سب جانوروں میں برتر تسلیم کیے گئے ہیں، یہ گتھی بہت پیچیدہ ہے اور عرصۂ دراز سے یونہی چلی آتی ہے۔ جنابِ اُلّو کو تو چنیا بیگم کے عشاق کی طرح دن بھر اونگھنے یا سونے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ سُنا گیا ہے کہ ایک دفعہ گدھے صاحب کو حضرتِ انسان کے اِس چغد پن پر نہایت سخت قسم کا غصہ آگیا۔ جس کے ثبوت میں آپ نے ایک دُبلے پتلے انسان کے جو انہیں آسانی سے قریب ہی مہیا ہو گیا تھا پوری طاقت سے ایک دولتّی رسید کر دی۔ اب بتائیے کہ وہ آدمی کا بچہ جو اپنی مادرِ محترمہ یا شفیق اُستاد کے ایک دوہتّڑ کی تاب نہ لا سکتا ہو، جناب کی دولتّی نوش کر کے کتنا ناچا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس غریب کو فوراً ہسپتال بھیجا گیا اور آپ کو غالباً "کانجی ہوز"، وہاں کسی چغد کو جو چغد پن سوجھا تو آپ کا بیان لے ڈالا۔ آپ نے نہایت اطمینان سے گلا صاف کر کے خاص بیرسٹرانہ انداز میں فرمایا کہ "ہمارے نازک کان انسان کے اِس چغد پن سے پک گئے کہ وہ جب اپنے کسی ہمجنس کی حماقت کا علانیہ اظہار کرنا چاہتا ہے تو اُسے گدھا" کہہ دیتا ہے اور جب ہم سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا تو ہم نے محض بطورِ احتجاج اِس آدمی کے ایک ہلکی سی لات ماردی تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت انسان کو اِس چغد پن سے روکنے کے کام آوے اور چونکہ یہ واقعہ محض ایک اشتعال کا نتیجہ ہے اِسلئے بموجب دفعہ فلاں قانونِ فوجداری گورنمنٹ ہند ہم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا"، لیجیے چھٹی ہوئی۔ اب یہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ انہیں اِس جرم میں کیا سزا بھگتنی پڑی۔ البتہ قیافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ انسان نے لاجواب ہو کر اُنہیں نہایت عزت و آبرو کے ساتھ بری کر دیا۔

خبط:- چغد پن سے ایک درجہ اور ترقی کی جائے تو خبط کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اِس درجۂ عالیہ پر فائز ہوتے ہی انسان کو کسی خاص شئے سے زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور تشخیص کرنے والے فوراً کہہ دیتے ہیں "خبطی ہو گیا ہے" خبط ہر شئے کا ہو سکتا ہے۔ گھوڑ دوڑ کا خبط، ٹکٹ جمع کرنے کا خبط، اور زیادہ اونچے پہونچے تو مضمون نگاری کا خبط، اور نوابی کی ترنگ میں آئے تو مقدمہ بازی کا خبط، خبطی ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی محبوب شئے کو دنیا بھر میں انتخاب کر لیتا ہو بلکہ اُس کے مقابلے میں وہ دنیا کی تمام چیزوں کو خواہ وہ اُس سے کتنی ہی بہتر اور سودمند کیوں نہ ہوں لچر قرار دے دیتا ہے۔ کسی گھوڑ دوڑ کے خبطی کے سامنے آپ کوئی عمدہ سے عمدہ مضمون پڑھنے لگئے اُس پر فوراً دیوانگی کا دورہ پڑ جائے گا اور وہ اپنے خبط کے ثبوت میں آپ کے ہاتھ سے مسودہ چھین کر بھاگنے سے بھی دریغ نہ کرے گا یا کسی پرانی تہذیب کے بزرگ کے سامنے موجودہ سُر الاپنے لگئے تو فوراً لاحول پڑھ کر آپ کے اِس طرح پیچھے پڑ جائیں گے۔ گویا آپ جیسے شیطان نما انسان سے بدلا لینا اُن کا مذہبی، اخلاقی اور تمدنی فرض ہے اکبر الہ آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ پڑھ کے بچّے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مراق:- آپ سے تعارف کیجئے۔ آپ بھی ایک عطیۂ قدرت ہیں اور خبط صاحب کے رشتے میں بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ آپ میں اور خبط میں صرف اتنا فرق ہے کہ خبط سے سرفراز ہونے کے بعد انسان کو ایک خاص شئے کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جچتی۔ لیکن آپ سے سابقہ پڑنے کے بعد اُس خوش نصیب کو کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں رہتا بس ایک دھن ہر وقت سوار رہتی ہے۔ دیوانگی کے اِس درجہ پر آکر انسان کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسرے حوائج ضروری کی فضول پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ فطرت نے بالکل ہی مجبور کر دیا تو خیر، ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں۔ کھانا مل گیا کھا لیا، نہ ملا مانگنے کی ضرورت نہیں۔ نیند نے مجبور کر دیا تو جہاں سینگ سمائے پڑ کر سو رہے۔ بچھونا کرنے کی نہ ضرورت نہ

فرصت، ایسے لوگوں کو بے تکلّف مراقی کہہ دیا جاتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اس کا بُرا بھی نہیں مانتے۔ سر کی ایک ہلکی سی جنبش یا لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ اس خطاب کے شکریہ میں پیش کر دی اور بس۔ البتہ یہ مراقی لوگ ہمیشہ بیکار ہی نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرزد ہو جاتے ہیں کہ اچھے اچھوں کو رشک ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ مراقی جنھیں لیڈری کا مراق ہوتا ہے عوام الناس کے بہت کام آتے ہیں مینڈکوں کی طرح اِن کی پیداوار کا بھی ایک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ لیڈری کے مراقیوں کی بہار دیکھنی ہو تو کسی الیکشن کے منتظر رہئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں جوتیاں چٹخاتے نظر آ جائیں گے۔ نہ کھانے کی خبر، نہ پینے کا ہوش، بس قوم کی فکر ہے۔ بدّھو نان بائی کا بچّہ مر گیا آپ جنازہ اُٹھائے سب سے آگے آگے۔ کلّو حجّام کی ماں کا تیجا ہے۔ آپ انتہائی شورٹ ہینڈ سے چنے پڑھ رہے ہیں۔ خیراتی پلّہ دار کے ولیعہد کی ختنہ ہوئی ہے آپ شیرینی کی طشتریاں تقسیم کر رہے ہیں۔ دولت سرا میں خواہ ملیریا نے مورچہ جما رکھا ہو، لیکن قوم کی خدمت بہر حال فرض ہے۔

باقی

صادق حسین قیصر میرٹھی

دھنک

ساغر نظامی

کرنوں کے چھوؤں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری
جوبن پر ہے رنگ راج کی رنگین راجکماری
چندری اپنی اُڑا رہی ہو برکھا رُت کی کنواری

اندر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رہ رہ کر پچکاری
یا کر کے اشنان لکشمی سُکھا رہی ہے ساری

بہشتِ گم شدہ

(حکیم سید احمد رشید زیبا فیض آبادی)

شباب شوق تھا اُمید کی جوانی تھی
شروع حسن محبت کی زندگانی تھی

زبانِ گل کی خموشی بھی نغمہ خوانی تھی
ہر ایک غنچے پہ چھائی ہوئی جوانی تھی

فضا تمام بہشتِ جمالِ معصومی
کہ مایہ دارِ حجاباتِ لن ترانی تھی

گھٹائیں آتی تھیں پیغام میکشی لیکر
یہ بادہ خوار پہ ساقی کی مہربانی تھی

بہارِ صبح تصدق، وہ کوہسار کی شام
نفس نفس میں جہاں عمر جاودانی تھی

نسیمِ صبح جو گاتی تھی سرمدی نغمے
شراب ریز تھی، پُر کیف تھی، سہانی تھی

اُڑا رہی تھی صراحی سے جام میں کوئی شے
بہت لطیف سی، ہلکی سی، ارغوانی تھی

بہم تھے شورش و تسکیں کے ایک جا منظر
ادھر نگاہِ محبت ادھر جوانی تھی

ستارے عارضِ افلاک پر چمکتے تھے
مہِ تمام کی ذرّوں پہ ضوفشانی تھی

نظر نظر میں لطافت، نفس نفس میں بہار
تخیلات کی اک جنتِ معانی تھی

برس رہی تھیں گھٹائیں تری نوازش کی
کہ ذرّے ذرّے میں سرمستیٔ جوانی تھی

تجلیات کا تھا اک ہجوم نظروں میں
مری نگاہ بھی فردوسِ غیر فانی تھی

حریم قدس کے پردے اُٹھے ہوئے تھے تمام
میں باریابِ محبت تھا کامرانی تھی

نیازِ عشق کے آگے جھکا ہوا تھا حسن
کہ داستانِ محبت تری زبانی تھی

نظر نظر تھی تری التجائے پیہمِ عشق
نفس نفس میں ترے سوزشِ نہانی تھی

حسین جسم پہ تھا لرزشِ خفی کا اثر | شرر آنکھوں سے پیہم گہر فشانی تھی
خوشا وہ عہدِ مسرّت زہے سرورِ خیال | نشاطِ کیف تھا، راحت تھی شادمانی تھی
کہاں سے لائیے وہ زندگی کیف و جمال | وہ زندگی نہ تھی اک خوابِ تھا کہانی تھی

بیا کہ تازہ نما داغ ہائے سینۂ مَن
بیا کہ غرقِ مسرّت شود سفینۂ مَن

پُوجا

میں پُجاری ہوں پُجاری!

:- جب میں ابھی بچّہ تھا چُپ چاپ مریض، منحنی اور میرے ماں باپ بچپن سے گھبراتے تھے تو میں اپنی نانی اور خالہ اور نانا سے لپٹا رہتا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور مجھے ہم عمروں میں آوارہ گردی کی اجازت نہ ملی تو میں اپنی آپا اپنی الماری اور اُس کے ایک ایک کونے سے چپٹا رہتا جب میرے دماغ میں ا، ب، ت ڈالی گئی اور خشک کتابوں کی زنجیروں نے مجھے جکڑ لیا تو میں نے مذہب و شاعری سے ربط پیدا کر کے ان کو اپنا تنہا راز داں بنا لیا۔

میں جو پُجاری ہوں ہمیشہ پجاری ہی تھا۔

برسوں میں اپنے دل کے نگار خانے کو آراستہ و پیراستہ کرتا رہا کہ شاید کوئی اِس کی سیر کو آ نکلے۔ لیکن اِس خاموش گنبد میں صرف تنہائی کی آوازیں رات دن اپنا سر ٹپکتی رہیں تو جب اور کوئی بُت نہ ملا تو میں اپنے رنج والم ہی کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر یُوں گر پڑا کہ آسمانوں پر ہلچل مچ گئی کہ دیکھنا، لینا، یہ پُجاری ہی پُجاری!!

پھر قسمت نے اور چال چلی اور میری فطرت نے ایک اور فریب کھایا۔ کسی کی کمائی ہوئی دولت میری ہوگئی جس نے مجھے اپنی تنگ آغوش میں لے لیا۔ تو میرا کیا تھا میں گوشہ گیر اِس سے بھی ہمکنار ہوگیا پھر جب میں نے ایک رفیق زندگی کو حاصل کیا تو محض اِس کی خوشی اپنا معمول ہوگیا اِس کے نام پر ایک مندر کھڑا کر دیا لیکن شاید ایک پیکر محبّت مجھ بیوفا پجاری کو کافی نہ ہوئی تو میں نے مندر کے نزدیک و دور اپنے تصورات و توہمات کا ایک بے پایاں باغ و صحرا پھیلا دیا جس میں خیالوں کے پھولوں کی اور کبھی کبھی کانٹوں کے ذرّوں کی پوجا میں بڑے شد و مد سے شروع کر دی۔ میں جو ہمیشہ ایک پُجاری تھا۔ اب بھی ایک پُجاری ہوں! (میاں بشیر احمد بی۔ اے آکسن)

عالیجناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث

اِس رفیع الشان خاندان کا سلسلہ اویس قرنیؓ سے ملتا ہے۔ اِن کی دسویں پشت میں اویس ثانی گزرے ہیں جو مدینہ میں اوقاف کے متولّی تھے اور یہ اپنے فرزند محمد علی کو لیکر وارد ہندوستان ہوئے۔ اور بہ زمانۂ عادل شاہ بیجاپور میں آکر سکونت اختیار کی۔ اِس خاندان کے اکثر اراکین نے اِس ریاستِ اَبدمُدّت کی مدار المہامی جیسی گرانمایہ خدمت انجام دیں، آج دکن میں صرف ایک یہی عظیم القدر، قدیم خاندان ہے۔ جس کے تمام معزز ارکان نے اپنی ذاتی شجاعت، دلیری، لیاقت اور دولت سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے کہ جس کے باعث ہمیشہ موردِ الطافِ خسروانہ رہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اعزاز و اکرام اِس ریاستِ ابدمُدّت میں اِس جلیل القدر اور رفیع الشان خاندان کو حاصل ہیں وہ دوسروں کو کم ہیں۔

ہمارے معزز صاحب تذکرہ نواب میر لائق علیخان مرحوم منیر الدّولہ عماد السلطنت، سالار جنگ ثانی (سابق مدار المہام) کے اکلوتے فرزند نواب میر سعادت علیخان مرحوم منیر الملک غیور جنگ، شجاع الدّولہ کے حقیقی بھتیجے اور نواب میر تراب علیخان مرحوم مختار الملک، سر سالار جنگ اوّل جی۔ سی۔ ایس۔ آئی (سابق مدار المہام) کے پوتے ہیں۔ آپ سالار جنگی خاندان عالیشان و خانوادۂ درگاہ قلی خان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ولادت یوم جمعہ ۱۴ شوال المکرّم ۱۳۰۶ھ م ۱۴ جون ۱۸۸۹ء م ۶ امرداد ۱۲۹۸ف میں ہوئی —— ولادت کے ایک ماہ بعد آپ کے عمّ بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اِس لئے حضور نظام (غفران مکان) نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ آپ کی کمسنی کی وجہ سے آپ کی جاگیر اور جائداد و املاک زیر نگرانی سرکار لے لی گئی اور خاص طور پر معتمد صاحب مالگذاری سرکار عالی اِس معزز اسٹیٹ کا انتظام کرتے رہے

۱۳۱۶ھ میں بتقریب جشن سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت غفران مکان نے آپ کو خطاب خان بہادری و سالار جنگ ثالث و منصب دو ہزار و پانصد سوار و علم و نقارہ سے سرفراز فرمایا۔ آپ نے اولاً بطور خانگی لائق استادوں سے گھر پر اور بعد ازاں مدرسہ عالیہ (اس مدرسہ کی ابتدا سر سالار جنگ اوّل مرحوم کے ہاتھوں محض امرا و رؤسا کے بچوں کی تعلیم کے لئے ہوئی تھی) میں شریک ہوکر اعلیٰ پیمانے پر تعلیم حاصل فرمائی، آپ علوم مشرقی و مغربی میں لیاقت تامہ رکھتے ہیں، اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں مثل اہل زبان کے گفتگو فرماتے ہیں۔ آپکی تحریر اور تقریر اردو، فارسی اور انگریزی نہایت شستہ اور دلچسپ ہوتی ہے۔ توجہ ذہانت آپ کا زمانہ تعلیمی بہت اچھا گزرا۔ الحاصل آپ لیاقت و قابلیت میں اپنی آپ نظیر ہیں، شکار، نیزہ بازی، شہسواری پولو، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور دیگر مردانہ کھیلوں میں بھی آپ کو مشق کرائی گئی۔ ان کھیلوں میں بھی آپ نے مہارت تامہ حاصل فرمائی اور آپ کو بیحد دلچسپی بھی ہے۔ خصوصاً پولو میں آپ کو اچھی مشق حاصل ہے۔ آپ کی ٹیم موسوم بہ "سالار جنگ"، اپنے نمایاں کھیل کی وجہ سے آج تمام ہندوستان میں مشہور و معروف ہے۔ آپ کی جاگیر کا رقبہ (۱۴۸۰) مربع میل یعنی ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست کی برابر ہے۔ اجنٹا کی کانیں اور مشہور عالم غار آپ کی جاگیر میں واقع ہیں، جاگیر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں دو لاکھ اور کئی ہزار تھی، علاقہ مفوضہ میں کئی عدالتیں اور جیل ہیں، جاگیر کی سالانہ آمدنی علاوہ دیگر جائداد کے بارہ لاکھ اور پچاس ہزار ہے۔ آپ اُن جاگیرداروں میں ہیں جنھیں فوجی، عدالتی، کوتوالی وغیرہ کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں آپکی جاگیر واگزاشت ہوئی۔ اسی سال راجہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ سرکار عالی کے رخصت کے سلسلے میں تین سال کے لئے آپ مدار المہام مقرر ہوئے گو آپ منصرم تھے، لیکن آپکے اختیارات مستقل مدار المہام کے برابر تھے اور ۱۹۱۲ء میں آپ کو مستقل مدار المہام مقرر فرما کر اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ، نے آپ کو ایک لاکھ کا گراں بہا خلعت عطا فرمایا۔ اور دسمبر ۱۹۱۴ء میں آپنے چھ ماہ کی رخصت پر خدمت سے علیحدگی اختیار کی۔ آپنے ہندوستان، عراق، عرب ایران اور یورپ کے تمام شہروں کی سیر فرمائی۔ نیز دو مرتبہ یورپ تشریف لے گئے۔ آپکا یورپ کے سفر کو جانا گو سیر و سیاحت پر مبنی تھا لیکن آپ نے اِن سفروں میں جو زبردست معلومات حاصل

فرمائی وہ حیطہ تحریر سے باہر ہے۔ ۱۳۴۸ھ میں عراق عرب، مصر و شام، بیروت، بیت المقدس اور ایران کا سفر فرمایا اور زیارت ائمہ علیہم السلام سے مشرف ہوئے۔ حال میں اور آخر ۱۳۵۵ھ میں آپ نے علاج کی غرض بار سوم یورپ کا سفر فرمایا اور بہ صحت تمام ماہ دوم ۱۳۵۳ھ میں وطن واپس آئے آپ کو اخبارات و رسائل اور کتب بینی کا نہایت شوق ہے۔ چنانچہ صدہا رسائل اور اخبارات کے آپ سرپرست اور معاون ہیں۔ شمالی اردو زبان کی مشہور اور مستند کتاب **بادۂ مشرق** مجموعۂ کلام حضرت ساغر نظامی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ ——— آپ علم دوست، سلیم الطبع، سیر چشم، دریا دل شریف پرور، کرم گستر، خوش اعتقاد، اولوالعزم اور عالی ہمت امیر ہیں۔ آپ کے الطاف وعنایات اکثر علماء، شعراء، ادبا، فقراء اور سائرین کے حال پر مبذول رہتے ہیں اور آپ کے در دولت سے ہزارہا اشخاص فیض یاب اور مستفیض ہوتے ہیں۔ سخاوت کو آپ پر ناز ہے کیوں نہ ہو آپ نواب میر تراب علی خاں مرحوم کے چشم و چراغ اور نواب میر لائق علی مرحوم حاتم وقت کے صاحبزادہ ہیں۔ آپ کی شگفتہ مزاجی، خوش خلقی اور فیاضی میں اپنے دادا نواب میر تراب علی خاں مرحوم سالار جنگ اول کے قدم بقدم ہیں۔

آخر میں ہم خوش اعتقادی کے ساتھ آپ کی عمر و دولت، عزت داقبال و صحت کے لئے بارگاہ صمدیت میں بصد خلوص دعا کرتے ہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

*

نظر کرم کی فراوانیوں پہ پڑتی ہے
پھر اپنے دامنِ خالی کو دیکھتا ہوں میں

ساغر نظامی

"تم اب بھی یاد آتے ہو"

تم اب بھی یاد آتے ہو بہارِ منظر بن کر
تم اب بھی دل میں رہتے ہو سراپا اثر بن کر
تم اب بھی دل پہ چھا جاتے ہو انوارِ قمر بن کر
میں سچ کہتا ہوں رہتے ہو حجاباتِ نظر بن کر
دفورِ چشمِ تر بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

یہ مانا غیر کے گھر گلفشاں بھی ہو گئے ہو تم
یہ مانا ماورائے جسم و جاں بھی ہو گئے ہو تم
یہ مانا میری نظروں سے نہاں بھی ہو گئے ہو تم
دلِ وحشی پہ گو نامہرباں بھی ہو گئے ہو تم
مگر جانِ خلش بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

نہ میرے دل میں ہیں ارمان و شوقِ زندگی باقی
نہ گلزارِ تمنّا میں ہے کوئی دل کشی باقی
نہ امیدوں کے چہرے پر کوئی رونق رہی باقی
اگر باقی ہے تو جذبات کی ہے بیکسی باقی
مگر ہمرازِ دل بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

نہ دریا کی ترنّم زائیوں میں چین ملتا ہے

نہ دشت و کوہ کی تنہائیوں میں چین ملتا ہے
نہ اہلِ عقل کی دانائیوں میں چین ملتا ہے
نہ اپنے درد کی گہرائیوں میں چین ملتا ہے
مگر تسکینِ جاں بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

اگرچہ قوتِ قلبِ حزیں پر اپنی نازاں ہوں
میں اپنی حالتِ پُر درد پر ہر چند خنداں ہوں
تمھیں گو بھول جانے کیلئے ہر وقت کوشاں ہوں
مگر میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری پہ حیراں ہوں
طلسمِ دلکشی بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

تمھاری یاد میں رونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
یہ دامانِ الم دھونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
تمھاری راہ میں کھونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
دعائے مستقل ہونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
مگر اشکِ دعا بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

میں اپنی آرزو کی زندگی کو تلخ پاتا ہوں
میں اپنے آنسوؤں کی نہر میں خود ڈوب جاتا ہوں
در و دیوار کو اب اپنا افسانہ سناتا ہوں

میں اپنی روح کی خلوت میں اب رونا ہوں گاتا ہوں
سراپا ہمنشیں بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

پریشاں ہوکے جب بستی سے کوسوں دور جاتا ہوں
جب اپنے دل ہی میں روتا ہوا مجبور جاتا ہوں
شراب کیفِ غم سے ہوکے جب مخمور جاتا ہوں
جب اپنے درد کی کیفیتوں میں چور جاتا ہوں
تو میرے ہم سفر بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

قمر ہوتا ہے جب بزم فلک میں انجمن آرا
فضا ہوتی ہے جب نغماتِ سحر افگن کا گہوارا
سرور و کیف میں جب ڈوب جاتا ہے چمن سارا
فنا جب ٹوٹ کر ہوتا ہے گردوں پر کوئی تارا
شکستِ سازِ دل بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

دُکھا دیتا ہے دل جب کوئی طعنے کی چبھن بنکر
نظر آتی ہے دوشیزہ کوئی جب یاسمن بنکر
مٹا دیتی ہیں جب مجبوریاں دار و رسن بنکر
تمنّا دل میں آتی ہے محبّت کا کفن بنکر
تو میرے نوحہ خواں بن کر — تم اب بھی یاد آتے ہو

تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

مرے جذبات پر جب سارا عالم تنگ ہوتا ہے
دل پُر غم جب آمادہ برائے جنگ ہوتا ہے
زمانہ جب مرے سر کے لئے اک سنگ ہوتا ہے
مری ہستی پہ جب طاری فنا کا رنگ ہوتا ہے

تو پیغام سکوں بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

خلش صدیقی بی، اے لکھنوی

ماضی

تُو اپنی معصوم ابدیّت کی گود میں جھلمل جھلمل کرتا نظر آتا ہے تیرے عہد کی مسرّتیں مجھے اپنی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہ میرا دامن چھوڑ کر مجھے میرے حال کے گرداب میں جس کے چکّر کی عمر بقدر یک لمحہ ہے غوطہ زنی کے لئے چھوڑ دیتی ہیں۔

اے ماضی تیرے عہد کے سب زخم پھول معلوم ہوتے ہیں اور مستقبل کی مسّرتیں زخم کاری کی موہوم اُمیدیں، جب تو میرے جسم کو چھوتا ہے تو مجھے آرام لذّت اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ جب حال مجھ سے مَس کرتا ہے تو میں ایک جامد شئے معلوم ہوتا ہوں اور جب مستقبل اپنے بازو میرے شانوں سے مَس کرتا ہے تو میں ایک طلسم لاینحل سے ہمکنار ہو جاتا ہوں۔ یہ طلسم مسّرت و غم، کامیابی و ناکامی، موت و زندگی۔ ارتقا و پستی، حسن و عشق، نامرادی و شادکامی، گلشن و صحرا اور عدم و وجود کا ایک ہنگامہ بن کر مجھ کو محیط ہو جاتا ہے۔ اے ماضی میرا حال دیکھ اور اپنی گود میں مجھے ابدالآباد کے لئے چھپا لے۔

ساغر

شباب کی فتح

(سیّد محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

"کائنات اپنے پیدا کرنے والے کو معلوم کرنے میں قاصر رہی ہے" یہ الفاظ کہے اور جمشید پھر ایک گہری فکر میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں کے اندر تمام عالم پر شب کی تاریکی چھا گئی۔ چاند روپوش تھا۔ لیکن خلائے ارمغانی میں ستاروں کی حکومت قائم ہو گئی۔ آسمانی دیوتاؤں کا رہبر مشتری اپنی تمام درخشانیوں کے ساتھ سنہری چادر خود اوڑھے ہوئے برآمد ہوا۔ جمشید مستغرق تھا۔ یکایک موسم گرما کی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے باغ میں یاسمین اور ملکۂ شب اٹکھیلیاں کرتے ہوئے جمشید تک پہونچے اور اُس کو بیدار کر دیا۔

قدرت کی ہزار زبانیں اِس سے ہمکلام ہونے کے لئے بیقرار تھیں، ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ آج جمشید کے کفر کو توڑ کر اِس منکر الٰہی کا دل حقیقت الٰہیہ سے منور کر دیا جائیگا

"پیدا کرنے والا۔ علت العلل۔ سبب اوّل، یہ سب اصطلاحات ظنی ہیں۔ اِنسان اپنے جہل کا اعتراف کرتا ہے۔ اسباب کا ایک سلسلہ خود اپنی عقل سے بنایا اور جب ابتدا معلوم نہ کر سکا تو ایک نقطہ پر لاکر انتہا کر دی۔ اصل مقصد دل کو اطمینان بخشنا تھا۔ اِس لئے اِنسان کے تخیّل نے خدا کا تصوّر کیا"

رات کی تاریکی کے ساتھ جمشید کے شکوک بڑھتے جاتے تھے۔ فضا کی خاموشی نے قلب و دماغ کو یکسوئی عطا کر دی۔ اِس لئے خیال و فکر الٰہیات کے تمام گوشوں پر نظر حقارت ڈالتے ہوئے الحاد و زندقہ کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ لے جا رہے تھے۔

جمشید کی عمر اِس وقت ۲۲ سال سے زائد نہ ہوگی۔ میانہ قد، خوبصورت آنکھیں، شباب کی سرخی اور قوّت ہر عضو بدن سے ٹپک رہی تھی چہرے پر متانت، انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ سے زندگی کو سنجیدہ زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اِس پر طرّہ یہ کہ تحصیل علم میں فلسفہ کا شائق تھا اور باوجودیکہ اِس مضمون میں ایک ہندوستانی یونیورسٹی کی آخری ڈگری حاصل

کر چکا تھا۔ لیکن ہنوز قدیم و جدید فلسفہ کے نظریات اِس کے پیشِ نظر رہتے تھے اور اِن پر غور و فکر کیا کرتا تھا۔ طبیعت اِس نو عمری میں اِس درجہ دقیق ہو چکی تھی کہ اشیاء کا ظاہری حسن اِس کے نزدیک ایک بے معنی چیز تھا۔ اِس کے استغراق و تفکر کو کسی کے پاؤں کی آہٹ نے ختم کر دیا۔ جمشید نے سر اُٹھایا اِس کی پشت کی طرف دو جھاڑیوں کے درمیان باغ کی ایک روش پر ایک جوان لڑکی برقی مشعل ہاتھ میں لئے خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ آنکھیں کسی چیز کو تلاش کرنے میں مشغول تھیں۔ جمشید نے لڑکی کو دیکھا اور بادل ناخواستہ کسی قدر بھاری آواز سے اپنی جائے نشست کی طرف لڑکی کو آنے کی دعوت دی ....

لڑکی۔ " بیوقوف! کیا اپنی تمام عمر اِن چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے میں صرف کر دے گا جو تیری عقل و ادراک سے بہت بلند ہیں ....

جمشید! ذرا نظر اُٹھا کر دیکھ۔ کائنات کا ہر ذرّہ تجھے پیغامِ مسرّت پہونچا رہا ہے، زہرہ اپنے حسن و جمال کو تیرے باغ کے تالاب میں دیکھ رہی ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ میں فطرت کا ایک شاہکار ہوں "۔

جمشید نے جو اِس مداخلت سے کسی قدر چیں بر جبیں تھا۔ برجیس، کی طنزیہ خطابت کو ٹھنڈے دل سے سُنا۔ اور پھر کچھ سوچ کر کھڑا ہو گیا۔ فلسفہ کے خشک اور دقیق دماغ نے جمشید میں رقیق جذبات کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

برجیس ایک ہمسایہ لڑکی تھی۔ معیارِ حسن کے لئے کوئی کُلیہ نہیں ہو سکتا۔ انفرادی ذوق اپنا اپنا معیار جداگانہ رکھتا ہے لیکن برجیس بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی سوسائٹی نے اُس کو ضرورت سے زیادہ شوخ بنا دیا تھا۔ اِس کی تعلیم معمولی تھی لیکن خلقی ذہانت اور تعلیم یافتہ گھرانے کی تربیت نے باقاعدہ تحصیل علم کی کمی کو پورا کر دیا تھا اور اِس کی معلومات عام مسائل پر اتنی کافی تھی کہ کسی علمی صحبت میں وہ مجبور اور عاجز ثابت نہیں ہوتی تھی، جمشید ایک خشک مزاج فلسفی تھا۔ اور اِس خشک انداز کے ساتھ برجیس کا دوست تھا۔ لیکن برجیس کے عمیق ترین گوشہ دل میں جمشید کے لئے ایک رقیق جذبہ موجود تھا جس کو وہ کبھی کبھی نادانستہ الفاظ میں ظاہر کر دیا کرتی تھی

برجیس! تمہاری نرگسیت بڑھتی جاتی ہے۔ فطرت کا شاہکار! فطرت ہے کیا چیز؟

کبھی تم نے غور کیا؟" جمشید نے متانت کے ساتھ کہا۔

"تمہارے دماغ کے سوا ہر چیز فطرت ہی۔ فلسفہ کے دور از کار مباحث نے تمہارے دماغ کو البتہ غیر فطری بنا دیا ہے۔ جمشید! کیا تم محبت سے بالکل نا آشنا ہو؟" برجیس نے سوال کیا۔

میں ہر اُس چیز سے نا آشنا ہوں جو حقیقت سے دور ہے۔ محبّت اور نفرت دو جذبے ہیں، دونوں ناپائدار۔ تجربہ سکھاتا ہے کہ محبّت کے مقابلے میں نفرت زیادہ پائدار ہوتی ہے۔" جمشید نے جواب دیا اور پھر کچھ سوچ کر برجیس سے پوچھا "برجیس! تم نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟

"محض اس لئے کہ تم کو الحاد کے قعرِ عمیق میں گرنے سے روکوں۔" برجیس نے کہا۔

جمشید نے یہ الفاظ سُنے اور مسکراتے ہوئے برجیس کے داہنے شانے کو پکڑ کر کہا۔

"کس قدر خوبصورت فریب ہے۔ حقائق اشیاء کا معلوم کرنا الحاد ہے؟ برجیس کائنات کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ اس کو کس نے بنایا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ انسانی فکر نے ارتقاء کے مختلف مدارج میں مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ تصوّرِ الٰہی ابتداء میں ہیبت ناک قوتوں تک محدود تھا۔ پھر خدا کو سزا اور جزا کا آلہ بنایا گیا۔ بالآخر انسانی تخیل کی بلند پروازیوں نے جلال و جمال، قدرت و کمال کا ایک نادر الوجود اور ما فوق الادراک تصوّر پیش کیا۔ ایک طرف یہ وجود ما فوق الادراک ہے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ اس کو تسلیم کرو۔ کیوں تسلیم کرو؟ اس لئے کہ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس پر کیوں ایمان لاؤ؟ محض اس لئے کہ چند مصلحین نے کہا ہے کہ حقیقت یہی ہے۔ وہ انسان جو ایک ذرّے کی ماہیت سے واقف نہیں وہ ایسے وجود کی ذات و صفات کا پتہ دیتا ہے جو جملہ کائنات کی خالق ہے۔ آخر اس عاجز انسان نے اس زبردست حقیقت کو کیونکر معلوم کیا۔ جبکہ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ وجود خداوندی ما فوق الادراک ہی۔ برجیس دوسروں کی طرح تم بھی اس خوشنما فریب میں مبتلا ہو۔ محبّت بھی اسی سلسلے کی ایک نازک کڑی ہے۔ تمہاری شوخ ادائیں اور ہواؤں میں اُڑتے ہوئے لمبے لمبے گھنے بال اس محبّت کی دعوت دے رہے ہیں جو انسانی زندگی کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ کتنے انسان ہیں جنھوں نے فلسفۂ محبت کے ہاتھوں اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ برجیس رقیق جذبات بالآخر بھاپ کی طرح اُڑ جاتے ہیں اور پھر زندگی کی افسردگی تمام

قوائے عمل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ تم فطرت کا ایک کھلونا ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنے مقصد حیات کو خیر باد کہہ کر تمہارے ساتھ کھیلنا شروع کر دوں" ؟

اِن آخری جملوں نے جہاں برجیس کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا وہاں اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ جمشید نے اِس کی توہین کی ہے۔ دماغ میں ایک تلاطم برپا تھا لیکن برجیس نا مہربان ہونا نہیں چاہتی تھی۔ آج ارادہ کر کے آئی تھی کہ جمشید پر فتح حاصل کرے گی۔ وہ اِس سے محبت کرتی تھی۔ جمشید کے الفاظ نے گویا توڑہ بارود میں آگ لگا دی۔ وہ دورِ حاضر کی مہذب لڑکی تھی۔ قدیم زمانہ کی بزدلانہ شرم و حیا اِس کے نزدیک مردوں کے سامنے اعترافِ شکست تھا۔ جمشید سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی اور صاف و سُریلی آواز میں کہا۔

" خدا اور اُس کا تصور ایک قدیم تخیّل ہے۔ جمشید تم اِس کو نہیں مانتے۔ فرض کرو کہ خدا موجود نہیں لیکن ہم اُس کے وجود کے قائل ہیں تو اِس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ لیکن جمشید اگر خدا موجود ہے جیسا کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے صناع کا پتہ دیتا ہے اور تم اس سے منکر ہو تو بتاؤ تمہارا کیا حشر ہو گا؟ خدا کا وجود یا عدم وجود دونوں ظنّی چیزیں ہیں اور اگر یقین نہیں تو مصلحتاً ہی تم کو اِس کا اعتراف کرنا چاہئے۔ نفسیاتی طور پر ہر انسان اطمینانِ قلب چاہتا ہے۔ اب ذرا غور سے دیکھو کہ اطمینانِ قلب تم کو حاصل ہے یا ان کروڑوں بندگانِ خدا کو جو خدا اور اُس کی امداد پر ایمان رکھتے ہیں۔ تمہارے دماغ کا ہر گوشہ خشک ہو گیا ہے اور اگر تمام عمر حقائقِ اشیا معلوم کرنے میں صرف کر دو گے تو بھی کچھ معلوم نہ ہو گا۔ پھر دانستہ زندگی کی مسرّتوں کو کیوں برباد کرتے ہو۔ ہوا کو دیکھو پھولوں کی نازک پنکھڑیوں سے چھُو کر اِن کی مہک کو تمہارے پاس پہونچا رہی ہے۔ آسمان کے ستارے تمہاری طرف جھکے جاتے ہیں اور ہلکی ہلکی روشنی پہونچا رہے ہیں، زمین تمہارے بوجھ کو اپنے سینے پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ کائنات کا یہ نظام اور ارتباط محض محبت پر قائم ہے اگر تم کو اپنے نظریوں سے محبت نہ ہو تو تحقیق و انکشاف کا دروازہ بند ہو جائے۔ حقیقتِ اشیاء معلوم کرنے کا ذوق تمہیں کس قدر محبوب ہے لیکن محبّت کو سب سے بڑی لعنت سے تعبیر کرتے ہو خدا جانے تمہارا توازنِ دماغی قائم ہے یا نہیں۔ میں فطرت کا کھلونا ہوں؟ تم اِس سے کھیلنا نہیں چاہتے۔ جمشید تم نامہربان ہی نہیں غیر مہذب بھی ہو۔ میں نے کب تمہیں اپنی محبّت کی دعوت دی ہے؟

تم پر ترس کھاتی ہوں، خدا تم پر مہربان ہے اُس نے تم کو حسین بنایا ہے۔ لیکن وہ جلد اپنے عطیہ کو واپس کر لے گا۔ چند برس تم اپنی زندگی مکمل طریق پر بسر کر سکو گے۔ شباب کے ساتھ تمھارا حسن اور اس کے ساتھ تمھاری فتحمندیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ ہر نیا دن تم کو ایک ہیبتناک انجام سے قریب کر رہا ہے وقت تمھارا رقیب ہے اور تمھارے گلابی رخساروں اور شباب میں چور جسم کے ساتھ متواتر جنگ کر رہا ہے۔ کیا اُس وقت کا تصور کر سکتے ہو جب تمھارے گالوں پر جھریاں پڑ جائیں گی۔ آنکھوں کی روشنی رفتہ رفتہ زائل ہوتی چلی جائے گی۔ بغیر سہارے بیٹھکر اُٹھ بھی نہ سکو گے۔ پھول کی نازک پنکھڑی مرجھا کر گر جاتی ہے۔ لیکن پھر اسی زمین سے دوبارہ پیدا ہو جاتی ہے۔ تمھارا شباب جب جاتا رہے گا تو اُس کی واپسی ناممکن ہے۔ شباب حیرت ناک لذتوں سے بھرا ہوا ہے۔ زندگی آج ہے اِس کو رائیگاں نہ جانے دو۔ اِس زمین و آسمان کے درمیان تمھارے خشک اور فرسودہ فلسفہ کے علاوہ اور دلچسپ چیزیں بھی موجود ہیں"

برجیس اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ تھک گئی تھی۔ لیکن ہیجانی کیفیت اِس پر طاری تھی۔ کنکھیوں سے جمشید کے چہرے کا رنگ دیکھ لیتی تھی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد جمشید نے مہر سکوت توڑی۔ چند قدم آگے بڑھ کر برجیس کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔ زبان سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جذبات کا سیلاب الفاظ کا ایک جملہ بھی مرتب نہ ہونے دیتا تھا۔ بالآخر ایک معنی خیز لہجہ میں کہا "برجیس! برجیس!! یہ ظلم ہے۔ صنفی قوت کا ناجائز استعمال ہے تم جذبات سے اپیل کر رہی ہو"

برجیس نے ہلاکت آفریں تبسم کے ساتھ کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ جمشید صنفی قوت کا اعتراف کرے" برجیس کی فطری شوخی عود کر آئی تھی اور اب وہ ہر پہلو سے جمشید کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اِس نے کہا۔ "جمشید! فلسفہ کے مالیخولیا نے تم کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے کی فکر میں ہمہ وقت اپنا دماغ خراب کئے رہتے ہو۔ لیکن روزانہ کی عملی زندگی میں تمھارا علم ابھی ابجد سے بھی آشنا نہیں۔ میں صرف دوستانہ تعلقات کی وجہ سے تمھارے پاس آئی ہوں تم نے اِسے عورت کی کمزوری پر محمول کیا اور چونکہ آسانی سے تم مجھ سے بات چیت کر سکتے ہو۔ اِس لئے بعض اوقات میری توہین کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ یاد رکھو

آج کے بعد برجیس اور تم دونا آشنا شخصیتیں ہوں گی۔ تم اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کرو۔ برجیس آئندہ تمھارے ذوق وشوق اور تحقیقاتِ علمی میں مخل نہ ہوگی"۔

یہ برجیس کا آخری لیکن تیز حربہ تھا۔ عورت کے ترکش میں ایسے صدہا تیر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جمشید بالکل مبہوت تھا۔ برجیس کا ہر لفظ کیوپڈ کی بے پناہ کمان سے تیر پر تیر برسا رہا تھا۔ مقصدِ حیات کی تمام راہیں چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ فلسفہ بھاپ کی طرح دماغ سے اُڑ گیا۔ برجیس حسن کی دیوی بنی ہوئی جمشید کے سامنے کھڑی تھی وہی آج اس کا مقصدِ حیات تھی اور اس کی پرستش جمشید کے فلسفہ کا نچوڑ۔ اس منکرِ خدا کی قلب ماہیت قابل دید تھی خدائے حقیقی پر ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو لیکن جمشید اس حسن کی دیوی کا پرستار ضرور بن گیا تھا۔

"جمشید! کیا ہوا؟ کیا تمھاری تمام کائنات ایک ضعیف عورت کے ناپائدار حسن نے پلٹ کر رکھدی۔ کچھ بتا سکتے ہو کہ اب کس منزل میں ہو؟" برجیس نے دریافت کیا۔

"برجیس! عورت کی قوت کا قائل ہوں میں اُس منزل میں ہوں جہاں نسل انسانی نے اصنام پرستی شروع کی تھی۔ یہ انسانیت کا ابتدائی دور تھا اور یہی میری زندگی کا آغاز ہے" جمشید نے کہا۔

"جمشید! میں تم سے محبت کرتی ہوں یہ عورت کی قوت نہیں ہے یہ شباب کا اٹل قانون ہے۔ نپولین نے بڑے بڑے تاجداروں کے سروں کو اپنے پیروں میں روند ڈالا لیکن حسن اور شباب کے مقابلے میں اکثر شکستیں اٹھانی پڑیں"۔

برجیس مسکرا رہی تھی۔ جمشید آگے بڑھا اور برجیس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر آخری نذرِ عبودیت پیش کردی .... یہ شباب کی فتح تھی۔

جمشید اور برجیس ایک کمرے میں بیٹھے ہیں ان کا آخری سلسلہ گفتگو اس طرح جاری تھا

جمشید "برجیس تم ہی مقصدِ حیات ہو۔ تمھاری ذات نے محبت کی حقیقت مجھ پر روشن کی ہے میں تم کو پوجتا ہوں"۔

برجیس "مرد بہت خوشامدی اور چاپلوس ہوتا ہے"۔

جمشید "عورت بڑی خوشامد پسند اور جادوگر ہوتی ہے"۔ ع عشق ازیں بسیار کردست وکند

مُفلس امیرزادہ

(بہ سلسلہ ماسبق "پیمانہ" ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء)

از سیّد محمد یحیےٰ صاحب میرٹھی

"کرسٹی!" جیرالڈ نے کہا "میں عنقریب کناڈا جانے والا ہوں۔ انگلستان میں کوئی ملازمت مجھے ابتک دستیاب نہیں ہوئی۔ روانگی سے قبل میں ایک مرتبہ اپنے اِس کھوئے ہوئے آبائی محل کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اِس لئے اِس طرف چلا آیا۔"

"میں ہر وقت آپ کو خوش آمدید کہوں گا" بوڑھے ملازم نے جواب دیا "لیکن کسی مزید گفتگو سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ کے خورد نوش کا انتظام کروں۔ میں کمرے میں آگ روشن کرتا ہوں آپ وہاں تشریف رکھیں تھوڑی دیر میں کھانا بھی حاضر کردوں گا۔"

عورت جیرالڈ اس تواضع کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن کرسٹی کی آنکھوں میں پختہ عزم کو دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ کرسٹی واپس گیا اور اپنی بیوی کو جیرالڈ کی آمد سے مطلع کیا۔ یہ نیک دل عورت بھی جیرالڈ سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنا اِس کا شوہر۔ فوراً اٹھی اور ایک گھنٹے کے اندر کھانا تیار کردیا۔

"بہترین کھانا تیار کیا جائے" کرسٹی نے اپنی بیوی کو مخاطب کرکے کہا۔ "اگر نیا مالک اعتراض کرے گا تو میں اپنی جیب سے اِس کھانے کی قیمت ادا کردوں گا۔"

"ماسٹر جان (جیرالڈ) تمام مکان میں گھوم رہا ہے۔ میں نے ابھی اس کی آواز سنی تھی۔ شاید اپنی ماں کے کمرے میں اس کی تصویر سے باتیں کررہا تھا" یہ کہا اور اُس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ پھر ٹھنڈی سانس کھینچکر اپنے شوہر سے کہا "کاش کہ پُرانا زمانہ واپس آجاتا۔"

کھانا تیار تھا۔ کرسٹی نے پُرانے دستور اور آداب کے موافق کھانا چُنا۔ امرا انگلستان کے گھرانوں میں ملازمین خاص سلیقہ اور شعور کو ملحوظ رکھتے تھے اور اِس وقت بھی کرسٹی یہی سمجھ رہا تھا

کہ وہ اپنے آقا کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ جیرالڈ اندوہناک مسکراہٹ سے کچھ سوالات کرتا تھا اور کرسٹی بڑی گرمجوشی سے اِن کا جواب دیتا تھا۔ یکایک سامنے والے دروازے پر گھنٹی بجی کرسٹی کا چہرہ فق ہوگیا۔ اور عرصہ تک وہ بُت بنا کھڑا رہا۔ اِس غیر متوقع آمد نے جیرالڈ کو بھی متوحش کر دیا لیکن بہت جلد اپنے حواس درست کرکے اِس نے کرسٹی سے کہا کہ "باہر جاؤ اور دیکھو کون ہے شاید کوئی مسافر راستہ بھول کر اِس طرف چلا آیا ہے"

خادم باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک جیرالڈ انتظار کرتا رہا اور پھر اپنے خیال میں مستغرق ہوگیا جیرالڈ کو اپنے پُرانے آبائی مکان سے حد درجہ محبت تھی۔ اِس کا خاندان پشتہا پشت سے یہاں رہتا چلا آیا تھا۔ زمانہ کی نامساعدت نے اِسے مجبور کر دیا تھا کہ اِس بیش قیمت محل کو فروخت کردے۔ ایک کمرے میں وہ کرسی پڑی ہوئی تھی جس پر اِس کی ماں بیٹھا کرتی تھی۔ جیرالڈ بغور اِس کرسی کو دیکھ رہا تھا تخیل کی آنکھوں نے پالن کو اِس کرسی پر لا بٹھایا اور اِس کو معلوم ہونے لگا کہ پالن ٹکٹکی باندھے ہوئے اِس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لیڈی ایلن کی ضیافت میں ایلن سے اِس کی آخری ملاقات ہوچکی اور اب شاید زندگی بھر اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوگا

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک تنومند آدمی جس کے سر پر بمشکل سے چند بال باقی رہ گئے تھے اندر داخل ہوا "اس تمام ہنگامہ کا کیا مطلب ہے" آنے والے نے کرخت آواز میں دریافت کیا۔ اِس کے پیچھے کرسٹی خوف زدہ کھڑا تھا اس کی طرف مڑ کر اِس شخص نے اِس سوال کو دہرایا اور غضبناک لہجہ میں ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" یہ انتہا ہے! میری عدم موجودگی میں تم میرے کھانوں اور میری شرابوں کو اپنے دوستوں کی ضیافت پر برباد کرتے ہو۔ تم جیسے ملازموں کو ملازمت میں رکھنے کا یہی انجام ہوتا ہے ڈلویل خاندان (جیرالڈ کا خاندان) کو دھوکا دینے میں تم کامیاب ہوگئے۔ لیکن مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اور تمھارا دوست دونوں چور ہیں۔

بوڑھے ملازم کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ وہ اپنی توہین برداشت کرسکتا تھا لیکن پُرانے آقا کی تذلیل اِس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ آگے بڑھا اور سخت لہجہ میں کہا۔ "آپ بغیر سوچے سمجھے گفتگو فرما رہے ہیں" اُس شخص نے کہا "آج تم اپنا بوریا بستہ

لے کر اس مکان سے نکل جاؤ" اس کی آنکھیں کھانے کی میز پر جمی ہوئی تھیں اور بار بار اسراف کا خیال اس کو غضبناک بنا رہا تھا۔ جیرالڈ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑی متانت کے ساتھ اس طرح گویا ہوا۔

جیرالڈ ایک شریف النسب امیرزادہ تھا اور "ہالم میز" کی عالیشان عمارت اس کا آبائی مکان تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے جیرالڈ اس مکان کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے خاندانی وکیل نے "ولیم مینارڈ (پالین کا باپ) کے ہاتھ بیچ دیا۔ لیکن نہ جیرالڈ کو یہ معلوم تھا کہ مکان کس شخص کے ہاتھ بیچا گیا اور نہ ولیم مینارڈ جانتا تھا کہ مکان کا پہلا مالک کون تھا۔ جیرالڈ کناڈا کا سفر اختیار کرنے سے پہلے چھپ کر آخری بار اپنے آبائی مسکن کو دیکھنے آیا تھا۔ یکایک خلاف توقع ولیم مینارڈ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ قارئین کی سہولت کی غرض سے ہم چند لفظوں میں گزشتہ منظر کا اعادہ کرتے ہیں

جیرالڈ کھانا کھا رہا تھا۔ یکایک ولیم مینارڈ آ گیا۔ جیرالڈ کو یہاں دیکھ کر وہ بہت برہم ہوا اور پرانے ملازم کرسٹی کو سخت سست کہنے لگا۔ اس کو خیال ہوا کہ کرسٹی اپنے دوستوں کی دعوت اس کی عدم موجودگی میں کرتا ہے اور سامانِ خورونوش کو برباد کرتا ہے اس لئے اس نے غصہ کی حالت میں حکم دیا کہ جیرالڈ اور کرسٹی دونوں فوراً مکان سے نکل جائیں۔

"آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہالم میز" کے نئے مالک آپ ہی ہیں۔ میری موجودگی پر جس قدر بھی اعتراض فرمائیں وہ بجا و درست ہے اور میں مودبانہ اس کی معافی چاہتا ہوں لیکن میرے دوست کرسٹی نے تمام عمر کبھی خیانت نہیں کی، جو کچھ اس نے کیا میری خاطر سے کیا۔ قصور سراسر میرا ہی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس کو ملازمت سے برطرف نہ کریں گے۔"

جیرالڈ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو پہچان لیا جائے۔ اس نے اشارے سے کرسٹی کو بھی منع کر دیا تھا کہ اس کا نام زبان پر نہ لائے۔ اسی وجہ سے کرسٹی خاموشی سے اپنے پرانے آقا کی شان میں نا ملائم الفاظ سنتا رہا۔

"تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ، سنتے ہو" نئے مالکِ مکان نے کہا۔ یہ شخص ولیم مینارڈ جوہری، پالین کا باپ تھا۔ پالین دروازے کے قریب اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا کر کہا۔

"مسٹر جیرالڈ!" اس کی آواز نہیں نکلتی تھی، بڑی کوشش سے کہا "آپ یہے

اس طرح یکایک ملاقات کا ہونا بہت خوشگوار ہے"۔ جیرالڈ سے اس نے مصافحہ کیا اور پھر اپنے باپ کی طرف مڑ کر کہا "اباجان! میں آپ کا تعارف مسٹر جیرالڈ سے کراتی ہوں یہ لیڈی آئن کے رشتہ دار ہیں اور ...... اور ...... پالن کی آواز میں لکنت پیدا ہوگئی۔ پھر اپنے کو سنبھال کر کہا "اور میرے دوست ہیں"

"شاید مجھے یہ فخر حاصل ہے"۔ جیرالڈ نے جواباً کہا۔

پالن کے دل میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ لیکن چونکہ جیرالڈ کی طرف سے اعتراف محبت کی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی اس لئے اس کی فطری حیا رقیق جذبات کو صرف گوشۂ دل میں پنہاں رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ جیرالڈ بھی اپنے افلاس کی وجہ سے اپنی محبت کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا۔

" جیرالڈ نے معذرت کرتے ہوئے ولیم مینارڈ کو بتا دیا کہ اس مکان کا پہلے مالک وہ خود ہی تھا۔ ولیم نے اس معذرت کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پالن خوش تھی کہ اس کے باپ نے "ہالم مینر" خرید لیا تھا۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں قدیم خاندان کے اخراج پر بھی اس کو افسوس تھا۔ جیرالڈ سے اس نے اپنے باپ کا تعارف کرانا چاہا لیکن ولیم مینارڈ کی فطری سنگدلی نے اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی لڑکی اس اجنبی سے ایسی بے تکلفی سے کیوں بات چیت کر رہی ہے۔ بالآخر جیرالڈ نے پست آواز میں پالن سے کہا۔

"اگر آپ کے والد بزرگوار میری جسارت کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تو کم از کم آپ ہی معاف فرما دیجئے"۔

پالن مسکرائی اور کہا "اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ بالکل قدرتی چیز ہے کہ آپ اپنے آبائی مکان کو دیکھنے چلے آئے۔ جہاں تک کرسٹی کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ ملازمت سے برطرف نہیں کیا جائے گا"۔

جیرالڈ نے الوداع کہا، پالن کا دل دھڑکنے لگا، لیکن جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اس نے جواب میں کہا "خدا حافظ! ..... آپ جب انگلستان واپس آئیں تو وعدہ کیجئے کہ ہم سے ضرور ملئے گا"۔ جیرالڈ مصافحہ کر رہا تھا اور اسکے ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی جاتی تھی۔ پھر کسی خیال سے اپنے کو سنبھال کر اس نے کہا "نوازش کا شکریہ، لیکن شاید میں انگلستان کبھی اپنی زندگی میں واپس نہیں آؤں گا باقی

پریم درپن

تمہارا تصوّر

تمہارا تصوّر مجھے بہت کچھ یاد دلاتا ہے !

وہ لمحات، جو فانی خوشیوں سے معمور تھے،

وہ دن، جب زندگی کی بہجتیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں ——— !

اور وہ بھولی بسری راتیں، جب ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے صبح کر دیا کرتے تھے!

وہ باتیں، جنھیں میں سمجھتی تھی کہ کبھی نہ ختم ہونے والی، اور غیر فانی ہیں —— لیکن وہ

درحقیقت اُس آواز سے زیادہ ناپائدار تھیں جو کلیوں کے شگفت کے وقت سُنائی دیتی ہے ——

وہ آج ماضی کے عمیق سکوت میں سوگئی ہیں، اِس طرح کہ اب کبھی دہرائی نہ جاسکیں گی !!

تمہارا تصور ایک پُرتسکین شعر ہے جس کے گنگناتے ہی میری روح وہاں پہونچ جاتی ہے

جہاں صرف تم ہو —— یا وہ خواب، وہ دلکش اور سہانے خواب، جو عہدِ ماضی میں میری روح نے

دیکھے تھے منتشر پڑے ہیں —— !!

اِسطرح جیسے چند نازک اور حسین پھولوں کی پنکھڑیاں تیز اور سرد ہوا کے جھونکوں سے

بکھر گئی ہوں !!

آنسہ حیا میرٹھی

برسات

(۱)

آج پھر سبزہ خلد آرا ہے　　یعنی برسات کارفرما ہے
اوڑھ لی ہے زمیں نے سرتاسر　　دلکش اور گہری سبز اک چادر
ہوگئے دشت آج لالہ زار　　ہوگئے سبزپوش سب کہسار
باغ میں رنگ کا ہے ہنگامہ　　دشت ہیں نزہتوں کا مجموعہ
کلیوں میں مسکرا رہی ہے بہار　　پھولوں میں جگمگا رہی ہے بہار
سارے منظر ہیں آج گلِ پیرا　　نور سے بھر گئے ہیں سب دریا
دشت ہیں سجدہ زارِ رنگ و بو　　وادیاں جوئبارِ رنگ و بو
احمریں جھاڑیاں گلاب کی ہیں　　اخضریں ڈالیاں گلاب کی ہیں
فیضِ فصلِ بہار جاری ہے　　ایک سیمیں لکیر ندّی ہے

آج ہر شے پہ چھا رہی ہے بہار
مجھ کو لیکن ستا رہی ہے بہار

(۲)

ہر چمن میں بہار کا سیلاب　　رشکِ جنّت ہے عالمِ اسباب
پتہ پتہ ہے مستِ کیفِ بہار　　ذرّہ ذرّہ ہے مستِ کیفِ بہار
کالی کالی گھٹائیں آتی ہیں　　ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے　　دل پہ بے اختیار پڑتی ہے
نغمۂ کیف زا فضا میں ہے　　کوئی بربط لئے گھٹا میں ہے
جھومتے ہیں تمام برگ و بار　　ہنس رہے ہیں تمام لالہ زار
بلبلوں کی نوا ہے کیف بدوش　　"پی کہاں"، کی صدا ہے غارتِ ہوش

چھایا دریا پہ رنگِ شام کیف — اُس کی ہر موج ہے خرامِ کیف
شب کی گہری سیاہی میں ہر سو — جگمگاتے ہیں سینکڑوں جگنو
یاد اُن کی دلا رہی ہے بہار
آہ مجھ کو ستا رہی ہے بہار

(۳)

پھول ہنستے ہیں رقص میں ہے صبا — چھائی ہے میرے دل پہ غم کی گھٹا
میرے دل پر الم کی بارش ہے — یاس کی اور غم کی بارش ہے
عشرتیں آہ! میری دھندلی ہیں — خلوتیں میرے دل کی سونی ہیں
اُلجھی ہے تارِ غم میں روح مری — دَب گئی بارِ غم میں روح مری
بھینی بھینی ہوا ہے نکہت ریز — میرے آنسو مگر ہیں طوفاں خیز
یاد رہ رہ کے اُن کی آتی ہے — اور دل کو مرے ستاتی ہے
وہ، کہ ہیں عشق کے چمن کی بہار — ہوں تصور میں جن کے میں سرشار
کاش بے اختیار آ جائیں — مثلِ ابرِ بہار آ جائیں
آہ! لیکن یہ ہے خیالِ خام — صبح ہوگی نہ میرے غم کی شام
نغمۂ کیف گا رہی ہے بہار
آہ! مجکو ستا رہی ہے بہار

آنسہ خورشید اقبال حیا میرٹھی

پیامِ بہار

کیا تجھے معلوم نہیں کہ بہار آگئی؟
بلبل کے محبّت بھرے راگ، کیا بہار کا رنگین الہام نہیں ہیں؟
کوئل کی دُکھیاری لَے، کیا بہار کا کافی ثبوت نہیں؟
یہ نمناک سبزہ،
نکھری ہوئی شاخیں،
رنگین پھول،
ندی کی مُترنّم لہریں، گھٹاؤں کی سیاہ دیویاں،
فضا کے اندھیرے راستوں کو چمکانے والے جگنو
کیا یہ سب بہار کے رومان خیز پیامبر نہیں ہیں؟
پھر تجھے کیوں نہیں معلوم کہ بہار آگئی؟
کیا اِس لئے کہ میں تیرے دل کے کنول پر اپنی محبّت کا مایوس راگ نہ چھیڑ دوں
اور تیرے دل کی کلی میری محبّت کے لئے کِھلنے نہ پائے؟؟
جس طرح بند کنول کو بھونروں کی بھیرویں میں ڈوبی ہوئی بھنبھناہٹ جگا دیتی ہے۔ آہ! تجھے معلوم ہے کہ بہار آگئی۔
مگر تونے اپنی پلکیں جُھکائیں، تاکہ میں سمجھ لوں کہ تو سو رہا ہے۔
اور ـــــ تونے یہ رنگین پیام نہیں سُنا!

آنسہ گوہر اقبال حور

تیری محبت

(اثر:- بلقیس جمال صاحبہ جمالؔ بریلوی)

تجھ کو اپنے نافۂ گیسوئے پیچاں کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنے دوش پر زلف پریشاں کی قسم
تجھ کو اپنی سرمئی چشم غزالیں کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنے جلوۂ بیباک و رنگیں کی قسم
تجھ کو اپنے عارضِ گل ریز و خنداں کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنے گوشۂ چاہِ زنخداں کی قسم
تجھ کو اپنے سرخ ہونٹوں کے تبسم کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنے مست آنکھوں کے ترنم کی قسم
تجھ کو میرے جذبہ و جوشِ تمنا کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنے عشوہ و اندازِ رعنا کی قسم
تجھ کو اپنے بیخودانہ بے نیازی کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنی جادوداں جادو طرازی کی قسم
تجھ کو اپنے مضطر و شوریدۂ غم کی قسم ۔۔۔ تجھ کو اپنے وحشیٔ گیسوئے برہم کی قسم

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حالِ زار سن
داستانِ دردِ تاریخِ دلِ بیمار سن

تیری الفت مرہمِ زخمِ دلِ رنجور تھی ۔۔۔ تیری الفت روح و جانِ عاشقِ مجبور تھی
تیری الفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی ۔۔۔ تیری الفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی
تیری الفت کا مغنی تھا ہر اک سازِ نفس ۔۔۔ نام لیتی تھی ترا تحریکِ آوازِ نفس
تیری الفت تھی مرے دل کیلئے بوئے شراب ۔۔۔ ہر نفس تھا اِس کی خوشبو سے محبت کا گلاب
اونگھنے لگتے تھے تارے جب خمارِ خواب سے ۔۔۔ تیری الفت جاگ اٹھتی تھی کنارِ خواب سے
سینکڑوں کلیاں چٹکتی تھیں نمو کے جوش میں ۔۔۔ تیری الفت پھول بنتی تھی مرے آغوش میں
سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب باغات میں ۔۔۔ تیری الفت مسکراتی تھی مرے جذبات میں

چاندنی راتوں کے کیف آگیں تجلیات میں
تیری الفت برق تھی غم خانۂ جذبات میں
الغرض تیری محبت تھی سراسر حیات
کائنات الفت تھی مجکو تیری الفت کائنات

نجمِ سحر

ڈوب جا میرے قسمت کے تارے کی طرح ڈوب جا' اے صبح کے اُداس اور زرد نجم سحر! تجھے اپنی پیلی پیلی سرسوں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی کرنوں کی قسم مجھے بھی اپنے ساتھ عدم کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنی تمام کائنات محرومی کے ساتھ ڈبو دے **بچے**! یہ دنیا کی امیدیں غفلت کی نیند سو رہے ہیں **نوجوان**، یہ مستقبل کی دنیا کے کھویا الہڑ نیند میں غافل ہیں۔ ان کے دل صبح شباب آتے ہی کنول کی کلیوں کی طرح شگفتہ ہوجائیں گے **بوڑھے**! یہ آغاز و انجام کی خوفناک تصویریں، موت کے منتظر رہتے ہیں۔ کوئی سو رہا ہے کوئی غافل ہے کوئی موت کی طرح سرد پڑا ہے۔ مگر میں تیرے ساتھ ساری رات جاگتی رہی ہوں، میں مخلوقات میں سب سے الگ ہوں، مجھے سب کی نگاہوں سے بچا کر عدم کے سمندر میں ڈبو دے، میں نہ سونا چاہتی ہوں نہ غافل ہونا چاہتی ہوں نہ سرد پڑنا چاہتی ہوں میں ڈوبنا چاہتی ہوں ناکامی اور المناکی نے میری روح کو، میرے دل کو، میرے احساس کو، میری ساری کائنات تک کو، نراش کردیا ہے نراش اے امید کی جھوٹی نشانی ڈوب جا اور مجھے بھی ڈبو دے۔

دنیا جس کے غافل پیکر کو تو تمام رات بھر گھورتا رہا ہے عبرت و حیرت سے جائزہ لیتا رہا ہے۔ میرے اور تیرے ڈوبنے کا احساس بھی نہ کرے گی۔ اس بھلاوے میں مت رہ کہ کل کی شام کو تو پھر چمکیگا۔ آج کا ڈوبنا عمر بھر کا ڈوبنا ہے۔ دنیا صبح ہوتے ہی نئے تاروں کی جستجو میں گم ہوجائے گی اور سورج کو دیکھ دیکھ کر جیے گی۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ڈوب جا اور ڈبو دے

بادۂ الہام

شعرائے عصر کے افکار

حضرت جگر مرادآبادی مدظلہ

(بطور خاص پیمانہ کے لئے)

رنگ و بو کی دنیا میں اب کہاں جواب اُن کا
عشق فرش بزم اُن کا حسن فرش خواب اُن کا

اوج پر جمال اُن کا جوش پر شباب اُن کا
عہد ماہتاب اُن کا دورِ آفتاب اُن کا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالم پُرآب اُن کا

کہئے حال دل لیکن دیکھئے کن آنکھوں سے
ہر سکوں کے پردے میں حشر اضطراب اُن کا

یونہی کھولے جاتے ہیں حسن و عشق کے اسرار
اک نفس سوال اپنا اک نفس جواب اُن کا

اور کس کی یہ طاقت اور کس کی یہ جرأت!
عشق آپ آڑ اپنی حسن خود حجاب اُن کا

رنگ و بو کے پردے میں کون چھوٹ نکلا ہے
چھپ سکا چھپانے سے کیا کہیں شباب اُن کا

جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے
نیم وا سی آنکھوں میں اُف وہ کیفِ خواب اُن کا

عرضِ غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اونہہ" کہہ کر سُن لیا جواب اُن کا

تو جگر سے مستوں پر طعن کر نہ اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اُن کا

حضرت ماہر القادری

دیکھنا! یہ کون بے پردہ نمایاں ہو گیا
ایک عالم بے نیازِ کفر و ایماں ہو گیا

آج اپنے کبر پر زاہد پشیماں ہوگیا
زہد نے اتنی ترقی کی کہ عصیاں ہوگیا

کھل ہی جاتا ایک دن تیری مسیحائی کا راز
وہ تو یہ کہیے کہ غم کا نام درماں ہوگیا

بحرِ وحدت میں اٹھی تھی آج اک بیتاب موج
عالمِ کثرت میں جس کا نام انساں ہوگیا

ٹھوکروں ہی ٹھوکروں میں پاگئے منزل ہم
مشکلوں ہی مشکلوں میں کام آساں ہوگیا

پھر کوئی نکلا ہی گھر سے لے کے دنیائے شباب
پھر کسی کمبخت کے مٹنے کا ساماں ہوگیا

میں نے ماہر آج کچھ اس طرح چھیڑا سازِ عشق
ذرّہ ذرّہ خاکِ ہستی کا غزلخواں ہوگیا

آغا حشر مرحوم کے دو غیر مطبوعہ شعر

آغا حشر مرحوم نے ایک خاص موقع پر یہ شعر ارشاد فرمائے تھے۔

جو خود کہتا ہے ہاں ہاں بیوفا ہوں بے مروت ہوں
اُسی ظالم سے مجھ کو پھر محبت ہوتی جاتی ہے

غضب ہے بھول کر بھی اب نہیں ملتی نظر تیری
یہ تجھ سے بھی زیادہ بے مروت ہوتی جاتی ہے

نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی، اے لکھنوی

حشر اذر اُس کے بعد کا ساماں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں دل کے داغ فروزاں کئے ہوئے

پھر دل ہے منتظر کسی یوسف جمال کا
آنکھوں کو فرطِ شوق میں زنداں کئے ہوئے

نظارہ ہے امیدِ تبسم میں گل بکف
دل کو فدائے جنبشِ مژگاں کئے ہوئے

ترکیب سوچتے ہے وہ اتہام کی
زخمِ جگر پہ سایۂ مژگاں کئے ہوئے

صحرا نہیں ہے کوئی ہمارے مذاق کا
بیٹھے ہیں اپنے گھر کو بیاباں کئے ہوئے

بکنے چلا ہے عشق کے بازار میں وہ شوخ
عصمت کو اپنے حسن کا درباں کئے ہوئے

پہونچے گا تیرے در پہ اثر ایک دن ضرور
آبادئ خیال کو ویراں کئے ہوئے

حضرت اظہار میرٹھی

نقاب رُخ پہ نہیں آنکھ میں حجاب نہیں
یہ اور کیا ہے اگر مستئ شراب نہیں

سنورئے شوق سے کچھ باعثِ حجاب نہیں
فریب آئینہ ہے آپ کا جواب نہیں

غضب یہ جلووں کا طوفان ای معاذ اللہ
کہ دل کو شوق ہی چشم ہوس کتاب نہیں

تمہارا دیکھنا اک غم کا پیش خیمہ تھا
وہ نیند اُچٹی ہوا اب تک مجالِ خواب نہیں

فریب عشق کی اللہ رے کارفرمائی
وہ غم دیئے ہیں کہ جنکا کوئی حساب نہیں

شبِ فراق بجز مرگ اور کیا ہوگا
سکوں نصیب نہیں تابِ اضطراب نہیں

حکیم زیبا صاحب فیض آبادی

یہ جو دل بے قرار ہے پیارے
عشق خود شرمسار ہی پیارے

تو جسے دیکھ لے نظر بھر کر
وہ مجسم بہار ہے پیارے

اک نظر دیکھ لے ترے صدقے
دل بہت بیقرار ہے پیارے

غم جو تونے عطا کیا اُس پر
ہر مسرت نثار ہے پیارے

دل کی فطرت میں ہے تڑپ اُٹھنا
دل پہ کب اختیار ہے پیارے

حسن پہ اعتماد کیا معنی؟
عشق پر اعتبار ہے پیارے

درد بخشا مجھے عفاک اللہ
درد ہی خوشگوار ہے پیارے

جلوۂ شوق و اہتمامِ نظر
تجھ پہ سب کچھ نثار ہے پیارے

ہر نظر میں ہے کیف و سرمستی
ہر نظر بادہ خوار ہے پیارے

نگہ آشنا بنا دے اُسے
وہ جو بیگانہ وار ہے پیارے

اس میں تیری خطا نہ دل کا قصور
عشق خود فتنہ کار ہے پیارے

یہ جو دیوانہ سا ہے اک زیبا
تیرا ہی جاں نثار ہے پیارے

حضرت مرزا بیضا خاں مروی ایرانی

جان موردِ اضطراب تا کے
دل درتنگ پیچ و تاب تا کے

از موت و حیات و حشر و عقبےٰ
برگردنِ من عذاب تا کے

اے جلئے تو بر سر و بچشم | از عاشق خود حجاب تا کے
توبہ نہ کنم ز شاہد و مے | دائم کا آخر شباب تا کے
بیدار شو اے نصیب خفتہ | از خواب بہ خیز خواب تا کے
بیضا بہ بلائے غم گرفتار | یا حضرتِ پوتراب تا کے

حضرت فطرت واسطی بی، اے

جب شام کو حسن صبح کا عالم ایک فسانہ بنتا ہے
جب چاندکی ضو سے زیرِ سما پُر نور خزانہ بنتا ہے

جب شوخ ستارے ہنستے ہیں اور نور کی بارش ہوتی ہے
جب حسن کے سارے عالم میں آنکھوں سے پرستش ہوتی ہے

جب عیش کی موجیں ہستی کو جھولے میں جھلانے آتی ہیں
جب نیند کی پریاں دنیا کو چپکے سے سلانے آتی ہیں

کچھ نیند سی طاری ہوتی ہے میں کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں
معلوم نہیں اِس عالم میں، میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں

احساس میں کچھ مدہوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
انفاس میں کچھ سرگوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے

بجلی سی چمکتی ہوتی ہے، پُرنور نگاہیں ہوتی ہیں
جذبات میں جنبش ہوتی ہے مخمور نگاہیں ہوتی ہیں

تم میری نظر کے دامن میں انگڑائیاں لیکر سوتے ہو
تم سانس کہیں بھی لیتے ہو، محسوس مجھے تم ہوتے ہو

یارانِ میکدہ

کیف حالکا ——؟ سُنا ہے کہ ڈاڑھی کے بعد آپ نے ماشاء اللہ گیسو بھی چھوڑ دیئے ہیں! لیکن شاید آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ صوفیانہ ارتقا کی ایک منزل "ڈسٹرکٹ گزٹ" کی ایڈیٹری کا ترک بھی ہے۔ گستاخی تو ہوگی مگر کیا آپ کی مجذوبانہ بیخودی یہ راہِ سلوک گم کردہ راہوں پر بھی کھول سکتی ہے کہ "ڈاڑھی" اور "گیسو" چھوڑنے کے ساتھ ساتھ آپ نے "نوکری" کیوں نہیں چھوڑی ——!؟!

کیا اس لئے نہیں چھوڑی کہ "پیری مریدی" کے لئے اکّا دُکّا سفید بالوں کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے اور ماشاء اللہ ابھی آپ کی ریشِ مبارک پہاڑی کوّے کو مات کر رہی ہے۔ —— جو کچھ بھی ہو مگر آپ کی "جوانمرگی" نے آپ کے شیدائیوں کو سر تا پا "الفاتحہ" بنا دیا ہے۔

یادش بخیر "سرخیلِ رنداں" کی یہ مصیبت بھی کتنی دلچسپ، دیدنی اور قابلِ رحم ہے کہ "بُت پرست" کے چنگل سے رہائی ملی تو "بُت شکن" کے پنجے میں تھے اور "بُت شکن" سے چھوٹے تو اپنے پنجۂ خودکش میں پھنس گئے! "بامن دیوتا" بزعمِ خود ترلوک کی ذمہ داری لئے ہوئے تھے اور مُلّا صاحب دوزخ وجنت کی، مگر انقلاب زندہ باد کہ "کلیمی" کی ذمہ داری اب خود اپنی "برق وطور" پر ہے۔

بیک وقت عبودیت ومعبودیت، اَرِنی و لن ترانی کی کشاکش ہے۔

کہاں سرخیلِ رنداں اور کہاں یہ کشاکش، کہئے دی۔پی فارم بھرنے میں دقت تو نہیں ہوتی؟

"یارانِ میکدہ" ہونے کی یہ شرط ہرگز نہیں کہ آپ زندہ رہیں اور لاپتہ، کوئی شک نہیں کہ

جوشؔ "کلیم" کی لپیٹ اور آپ "شعلۂ طور" (؟) کی جھپیٹ میں ہیں —— مگر محض آپ ہی کو نہیں ساغرؔ کو بھی بادۂ شیراز سے کچھ تعلق ہے —— !

واللہ جس دن ہم نے "ارنی" کہا وہ تمام حجابات پھونک کر خود نکل آئیں گے۔ اور ہم مسکرا کر آپ کی طرف اشارہ کر دیں گے —— اب تو مین پوری بلا لیجئے !؟

اُس گلچیں کے اثر کا کون اندازہ کرسکتا ہے جو بمبئی میں بیٹھے بیٹھے دہلی کے چمنستان سے گلاب کو اس طرح توڑے گو یا میز پر رکھا ہوا تھا۔ بہت اچھا میں نے بھی اک "جلالی عمل" شروع کر دیا ہے۔ "ہینگنگ گارڈن" اور آپ کو کچھ دنوں میں نئی دہلی کی زینت ہوں گے، ورنہ خیریت اسی میں ہے کہ —— !

غزل کے استراد میں جو مضمون کلیم میں شائع ہوا تھا وہ اتنا مسکت و مدلّل تھا کہ آپکو نہ صرف خاموش کر گیا بلکہ بیمار بھی ڈال گیا۔ اگر آپ تنہائی میں اعتراف شکست کریں تو ہم آپکو اب بھی بتا سکتے ہیں کہ آپ کا "قاتل" آپکے دوستوں ہی میں سے ایک ہے، اور آپکی نگاہوں کے سامنے ہنستا بولتا اور آزاد چلتا پھرتا ہے۔

اور اگر آپ ہم کو، کوئی بڑی رشوت دیں تو "جمالو" کا بھی پتہ دیا جاسکتا ہے۔ —— مگر یہ تو بتا دیجئے کہ آپ اب جامعہ والے اپنے مضمون پر ایمان تو نہیں رکھتے !؟

کچی نیند سے جگا کر آپ کا یہ کہنا کہ غازی آباد تک چلو، اور پھر میرٹھ اسٹیشن سے چپ چاپ گھر واپس آجانا۔ میرٹھ کو غازی آباد بنا دینے کے لئے کافی تھا —— اسی دن سے میرٹھ سٹی اسٹیشن کے درو دیوار پر "غازی آباد" لکھا دیکھا گیا۔ پڑھنے والوں نے کہیں کہیں یہ مصرع بھی پڑھا۔

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا —— !؟

"س"

تمام عوام و خواص کی اطلاع کے لئے میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ "علی گڈھ پرنٹنگ پریس" دہلی کے مالک یا منیجر ضیاء الرحمن صاحب کی غلط بیانی کے متعلق کہ "کتاب بادۂ مشرق" مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ، علی گڈھ پرنٹنگ پریس میں طبع ہوئی ہے"، ایک واضح اعلان کرکے پبلک کو یہ بتا دوں کہ علی گڈھ پرنٹنگ پریس دہلی کے مالک بادۂ مشرق گاہکوں کو دکھاکر کس طرح کام حاصل کرتے ہیں۔

اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ:-

عالیجناب راؤ بہادر حاجی محمد عبد الحمید خاں صاحب منظرؔ رئیس اعظم باغپت نے ساغرؔ صاحب سے فرمایا کہ علی گڈھ پرنٹنگ پریس والوں نے ان سے یہ کہا کہ بادۂ مشرق ہمارے پریس میں چھپا ہے، اور اس بنا پر انھوں نے اپنی کتاب "آفتاب رسالت" علی گڈھ پرنٹنگ پریس میں طبع ہونے کے لئے دیدی۔

لیکن محض اس لئے کہ ضیاء الرحمن خاں شروانی میرے ہم وطن ہیں اور ان کی یہ حرکت نازیبا، انتقام کے بجائے رحم کی حقدار ہے۔ اسلئے میں ہر خیال سے درگذر کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ مسئلہ حقیقت یہ ہے کہ بادۂ مشرق صفحہ نمبر ۱ سے لے کر صفحہ ۱۸۴ تک تمام و کمال (جس میں اس کے پس ٹائٹل منظر بھی شامل ہیں) ساغر پریس میرٹھ ہی میں طبع ہوئی ہے۔

اس لئے ضیاء الرحمن خاں ہی نہیں ہندوستان کا جو مطبع بادۂ مشرق دکھا کر گاہکوں سے کام حاصل کرتا ہے غلط بیانی، جعلسازی اور پریس بہادری کا مجرم ہے اور پبلک کو ایسے شخص سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

جو صاحب بادۂ مشرق جیسی شاہکار کتاب چھپوانا چاہیں وہ براہِ راست ساغر پریس
ٹھ سے خط و کتابت کریں یا خود میرٹھ تشریف لائیں جہاں کتابت کو خود ساغر صاحب کی نگرانی
ں مکمل طور پر طبع ہو تیار ہوئی ہے۔ دعویٰ نہیں لیکن بہ ادب گذارش ہے کہ بادۂ مشرق کی
اعت کے کمال کا ریکارڈ اگر کوئی توڑ سکتا ہے تو یقین فرمائیے کہ اس نیلگوں آسمان کے
یچے صرف ایک پریس ہے اور وہ صرف ساغر پریس میرٹھ۔

خاکسار احدیار خان (مینجر)

مشتہرین کیلئے بہترین موقع

رسالہ پیمانہ سے کوئی شہر اور کوئی قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے پندرہ بیس
خریدار نہ ہوں۔ اگر آپ اپنی تجارت کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو رسالہ "پیمانہ" میں اپنا تجارتی
شتہار دیجئے۔ پیمانہ کی اشاعت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے
ملکوں میں بھی اس کے مستقل خریدار موجود ہیں، اس میں اشتہار دینے کے بعد آپ کو خود
حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

نرخ نامہ حسبِ ذیل ہے

مدت	پورا صفحہ	نصف صفحہ	¼ کالم
ایک سال	عـ۲۰/	عـ۱۲	لـے/
۶ مہینہ	عـ۱۰	لـے	ے/
۳ مہینہ	عـہ	ے	ـہ/
ایک بار	ـہ/	ـہ	۱۲/

نوٹ، اشتہار کی اجرت بذریعہ منی آرڈر پیشگی آنی چاہئے، ورنہ اشتہار طبع نہ ہوگا۔ مینیجر پیمانہ ادبی مرکز

بادۂ کہن

پیمانہ کے گذشتہ منتشر نمبر ایک جلد کی صورت میں

دورِ اوّل	پہلی جلد سائز	۲۰×۲۶/۱۶	مع محصول ڈاک	محض ایک روپیہ
دورِ ثانی	دوسری جلد	۱۷×۲۷/۴ (بادہ مشرق سائز)	"	محض بارہ آنے ۱۲/
دورِ ثالث	تیسری جلد	۲۰×۳۰/۸ (نگار سائز)	"	محض ایک روپیہ آٹھ آنے ۱/۸

ہر جلد بادۂ کہن کے نام سے جدید سرورق سے آراستہ کر کے مرتّب کی گئی ہے، اور دفتر "پیمانہ" ادبی مرکز میرٹھ سے ملتی ہے، مندرجہ بالا قیمتیں نمبروں کی اصل قیمت سے ۱/۴ مقرر کی گئی ہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ ادب کے ذوق رکھنے والوں تک یہ تحفہ پہونچ جائے اور اس سے جو کچھ حاصل ہو وہ موجودہ پیمانہ پر صرف کر دیا جائے اتنی کم قیمت میں ایسی مجلّدات مل جانا ایک حسنِ اتفاق ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

منیجر

مکتبہ ساغر "ادبی مرکز" میرٹھ

سرودِ شباب

(جوانی کے موضوع پر اردو شاعری میں سب سے عجیب اور جدید کتاب)

سنہ ۱۹۲۵ء میں "شبابیات" کے عنوان سے ساغر نظامی کی ۶۴ رباعیاں شائع ہوئی تھیں، اب گیارہ برس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن "سرودِ شباب" کے نام سے کافی ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اپنی نئی ترکیب کی بنا پر یہ بجائے خود ایک نئی تصنیف ہے۔ شبابیات میں محض شاعر اپنے شباب کا مغنّی تھا لیکن گیارہ برس میں شعور نے سینکڑوں منزلیں طے کیں اور وہ اس منزل پر آ پہونچا جہاں خود فریبی، خودنگری یا خودپرستی، بیخودی اور خودستائی حسن کی مدّاحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے حصّے میں شاعر اپنی جوانی کے گیت پوری سرمستی سے گاتا ہے اور دوسرے حصہ میں حسُن کا نغمہ گر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کتاب "بادۂ مشرق" سائز پر چھاپی گئی ہے اور ہر رباعی کی تصویر پسِ منظر (Back ground) میں دی گئی ہے اس التزام نے کتاب کو جوانی کا طلسم زار بنا دیا ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ اور کتابت اعلیٰ ترین ہے۔ چھپائی میں "ساغر پریس" نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ جلد بندی کے بجائے کتاب کو ریشمیں فیتہ سے باندھا گیا ہے ٹائیٹل رنگین، بلاک کا ہے اور آرٹ کا بہترین نمونہ۔ قیمت عہ، علاوہ محصول

• پرنٹر و پبلشر اسد یار خان صہبانے "ساغر پریس" میں چھپوا کر ادبی مرکز میرٹھ سے شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر اے

زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ دار

دوشینہ شکستیم بیک توبہ دو صد جام
امروز بیک جام دو صد توبہ شکستیم

پیمانہ

زیرِ نظر
ساغرِ نظامی

مُدیر صہبا

ادبی مرکز میرٹھ

ساغر نظامی کا مکمل مجموعۂ نظم و غزل

بادۂ مشرق

قیمت صہ فی جلد سائز ۲۷×۱۷ جلد آرٹ کا اعلیٰ نمونہ مضبوط و حسین، کاغذ بہترین ۳۲ پونڈ

محترمہ جہاں آرا بیگم شاہنواز ایم، ایل، اے کی رائے

"ساغر نظامی ہمارے اُن نوجوان شاعروں میں سے ہیں جو ہمیں مستقبل کا اُمید افزا پیغام دیتے ہیں ہمارا قومی ادب پستی اور یاس کی گہرائیوں میں گر چکا تھا، خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بعض نوجوان ادیب اسے امید و اتحاد کی بلندیوں کی طرف لئے جاتے ہیں، ہمارے ملک و قوم کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے ایسے شاعروں کا وجود ایک قومی کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ جو قوم کے افراد کو یگانگت، انسانی ہمدردی اور نظری توانائی کا سبق دیں۔ ساغر صاحب ایک ایسے شاعر ہیں۔ اِن کے پڑھنے کا انداز سونے پہ سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ اِن کی نظمیں انھیں سے سُننی چاہئیں۔ سُننے والے پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا اثر مدّت تک قائم رہتا ہے۔

میں نے فرصت کے اوقات میں اُن کا دیوان بادۂ مشرق پڑھا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کہ یہ لاجواب کتاب پڑھنے اور پاس رکھنے کے قابل ہے۔ اس کی ظاہری و معنوی خوبیاں یکساں ہیں۔ جابجا خوبصورتی اور رنگینی نے ظاہری اور معنوی حیثیت نے ایک اَدَبی گلزار کی صورت پیدا کر دی ہے۔ بادۂ مشرق ہر ہندوستانی گھر میں موجود ہونا چاہئے۔"

جہاں آرا شاہنواز از لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء

حضرت اشرف نواب میر یوسف علی خان بہادر سر سالار جنگ ثالث

میخانۂ ادب میں پیمانہ کا خیر مقدم

ہفتہ وار تیج دہلی
۱۳ جولائی ۱۹۳۷ء

بہت دنوں کی بات نہیں کہ ہندوستان کا مشہور علمی و ادبی رسالہ "پیمانہ" شائع ہوا کرتا تھا۔ اکبرآباد میں اس نے اپنی زندگی کے چار دور گزارے اور اب اس کی اشاعت کا پانچواں دور میرٹھ سے جناب ساغر کی زیر نگرانی شروع ہوا ہے۔ اس کا پہلا پرچہ ہمارے پاس ریویو کے لئے آیا ہے۔ جو گوناگوں خوبیوں سے لبریز ہے اور یقیناً زندگی کے جمالیاتی رُخ کا آئینہ دار ہے۔ نثر کا پہلا مضمون "وکٹر ہوگیو" کے ایک شاہکار "محبت" کا ترجمہ ہے اور پہلی نظم "صبر کر" کے عنوان سے حضرت جوش ملیح آبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ باقی مضامین بھی بلند پایہ اور قابل داد ہیں۔ رسالہ کی ترتیب بہت اچھی ہو۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ساغر کی نگرانی میں "پیمانہ" کا یہ پانچواں دور بھی بہت کامیاب ہوگا۔ یہ چند سطریں تعارف کے طور پر لکھدی گئی ہیں۔ مفصل ریویو ہم کسی آئندہ اشاعت میں درج کریں گے۔

جامِ صہبا

دیکھ کر مجھ کو مسکرا بھی دے ۔۔۔ دولتِ دلبری لُٹا بھی دے
دردِ دل مجھ کو بخشنے والے ۔۔۔ دردِ دل کی مجھے دوا بھی دے
غم دیا ہے تو او ستم پرور ۔۔۔ فرصتِ دردآشنا بھی دے
رحم فرما مری نگاہوں پہ ۔۔۔ بجلیوں کا نقاب اُٹھا بھی دے
پار طوفاں سے ہو سفینہ ابھی ۔۔۔ کچھ سہارا جو ناخدا بھی دے
طرحِ توحیدِ عاشقی فرما ۔۔۔ درمیاں سے حجاب اٹھا بھی دے

گو نہیں ظرفِ عشق صہبا میں
جام ہلکا سا اک پلا بھی دے

"ایڈیٹر"

جُرعات

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پیمانہ کے پہلے ہی دور نے ادبی دنیا میں زندگی کی نئی سرمستی پیدا کر دی اور میخانۂ ادب میں جس مسرّت کے ساتھ اِس کا خیر مقدم کیا گیا وہ نہ صرف اِس کے بادۂ ادب کے کیف آور ہونے کا ثبوت ہے بلکہ تشنہ کامانِ ادب اور بادہ کشانِ صناعت (آرٹ) کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی ہے۔

صحرا سے فصلِ گلستاں تک مستی　　ہے آج زمیں سے آسماں تک مستی
وہ جامِ خرد سوز ہے لے جانِ حیات　　چھا جائے مکاں سے لامکاں تک مستی

اور حقیقت یہ ہے کہ پہلا جام جس بیتابی اور بے صبری سے ڈھالا جاتا ہے کچھ اِسی نوعیت سے پیمانہ کے پہلے نمبر کی ترتیب ہوئی۔ مگر یہ نمبر نتیجہ ہے قدرے سرور کا اِسلئے میکشوں کے حسنِ طلب کے ظرف و ذوق کے لحاظ سے شراب زنگار رنگ سے لبریز ہے۔ یعنی گدائے میکدہ "کسی پیمانے میں" بہ فضلِ ساقی "ہر طرح" کی موجود ہے اور سیری کا یہ عالم ہے کہ ؎

"جتنی پی لی ہے ابھی اُتنی ہی پیمانے میں ہے"

ہر کام کے لئے ایک مناسب شُبھ گھڑی ہوتی ہے سو میری ایماندارانہ (بے ایمانی کا میخانہ میں امکان نہیں) رائے ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء پیمانہ کے آغاز کے لئے شُبھ گھڑی نہ تھی یہ وہ موسم تھا کہ خود ساقی تناسب ہوش سے محروم اور پیمانہ کیف و کم سے عاری تھا۔

پینے پلانے کا موسم تو اب آیا ہے کہ "نشے سے ہے کل سوادِ اعظم بیخود" اور اِس بیخودی میں خودی کا وہ جوش ہے کہ ہر لغزش بجائے خود اعتماد ہے۔ ساغر کی "خامکاری" پختہ کیفی کی ضامن ہے اور بیخودی اپنا آپ اہتمام ——— !

اللہ اللہ یہ میکدے کا نظام
مقتدی ہے کوئی نہ کوئی امام

اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر دور اپنے دورِ ماقبل سے کیف و مستی میں کسی طرح بھی کم ثابت ہو گا بنام ساقی دورِ پیمانہ کا آغاز ہوا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ ہر پیمانہ کچھ ہی دنوں میں بجائے خود "میخانہ" نہ بن جائے اور رندانِ بادہ خوار سرشار ہو کر چیخ نہ اٹھیں ؎

کب تک آخر جرعہ جرعہ قطرہ قطرہ ساقیا　　لا اُلٹ لیں آج پیمانہ میں کُل میخانہ ہم

لِلّٰہ الحمد، یہ بزمِ میکدہ "کوئی کم خور" بادہ کشوں کی انجمن تو ہے نہیں یہاں تو جو ہے "معیاری" ہے۔ ایک طرف جوشؔ و جگرؔ، اخترؔ و آزادؔ ہیں تو دوسری طرف اخترؔ و حفیظؔ، فطرتؔ اثرؔ ہیں ادھر نشیرؔ و یحییٰؔ ہیں تو اُدھر مخمورؔ و نیازؔ۔ اُٹھ اُٹھائے تو ساقی جام بدست — نظر بچائیے تو بادہ کش سچ پوچھئے تو امتیازِ "ساقی و مے کش" کہاں؟ ایک دوسرے کو اپنا ہوش ہیں، میکدے کے سورج کا کیا ذکر، میخانے کے سوئے اور دبے ہوئے ذرّے پکار رہے ہیں

میرے حالات پر نہ جا ساقی　　ہاں پلا جامِ مے پلا ساقی
ارتقا گر ہے انتہائے زوال　　ہے تنزل بھی ارتقا ساقی

اِس عالم سے جو دُور ہے اُس کو اپنی بدبختی کے "رجسٹرڈ ہونے" کا یقین کر لینا چاہیے۔ اور جو منکر ہے وہ ——————— !

——— ! سعادت کچھ اسی میں ہے کہ سرِ شام درِ میخانہ پر صدا دی جائے !

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

ساغرؔ

تاریخ کی لغزشیں

(سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

تاریخ جہاں ماضی کے تجربات سے حال پر اثر ڈالتی ہے اور مستقبل کے لئے بہتری کا سامان فراہم کرتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس کے مغالطے قوموں میں تصادم و نفرت کے محرک بھی بن جاتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ دنیا تاریخ کے صفحات میں ضمیر انسانی کے نشوو ارتقا اور مدارج آزادی کو تلاش کرنے کے بجائے قومی عظمت و برتری کے افسانوں کو ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ مورخ کا قلم پیدائشی ماحول اور عقائد و نیز قومی سیاسیات کی مصلحتوں سے مبرا ہو کر حقیقت نگاری اور صحیح تحقیق کا توازن بہت کم قائم رکھ سکا ہے۔ اور اگر آج ہم انسانی برادری کے صدہا تنازعات کے اسباب کی چھان بین کرنے بیٹھ جائیں تو کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے جو مصلحت طراز دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ثابت ہوں گے اور حقیقت سے انہیں دور کا بھی تعلق نہ ہوگا۔ علم الاجتماع کے بانی اوّل علامہ ابن خلدون نے اس ناجائز آمیزش کو دور کرنے کے لئے مجبوراً یہ قاعدہ مرتب کیا کہ جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا، اتنی ہی زیادہ افسانہ سرائی اسے اپنے حصار تخیل میں لے لیگی۔ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس رمز کو زیادہ لطیف

پیرایہ میں اس طرح ادا کرتا ہے کہ "انسانی عظمت کی انتہا یہ ہے کہ افسانہ بن جائے۔"

ہندوستان کی تاریخ اس قسم کے تاریخی شعبدوں سے بھری پڑی ہے اور اگر آج محتاط تاریخی شہادتوں کو جمع کیا جائے تو شاید ایسی تاریخ پیدا ہو جس کی روشنی میں وہ بہت سے تنازعات خود بخود نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی سرزمین متضاد جذبات میں تقسیم ہو چکی ہے، ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور چونکہ طلبا میں تحقیق کا مادہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کی تعلیم کا اصل منشا صرف چند درسی کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ حقیقت سے بیخبر رہتے ہیں اور غلط معلومات کے زہریلے جراثیم لے کر جب وہ میدانِ عمل میں آتے ہیں تو باہمی اختلاف کی خلیج کو وسیع تر کرنے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ جب ہندوستانی طالب علم تاریخ کے مطالعہ میں مصروف ہوتا ہے تو بصیرت اور صحیح قوتِ فیصلہ اس کی رہنمائی نہیں کرتے، عقائد ذاتی کے دبیز حجابات اس کی دماغی اور تنقیدی قوتوں کو بیدار ہونے سے روکتے ہیں، قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھتے وقت ایک مسلمان طالب علم کا زاویۂ نگاہ تلاش حق سے اتنا ہی دور ہوتا ہے جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی، وہ پراچین تہذیب میں بت گری اور اصنام پرستی کے سوا کوئی چیز نہیں دیکھتا، اس کی متعصب نگاہ ان خوبیوں کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے جو ہندوستان کے شاندار ماضی میں پنہاں ہیں، وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ جب کرۂ ارض کا بڑا حصہ درختوں کے پتوں یا جانوروں کی کھالوں سے اپنی عریانی کو ڈھانپتا تھا اُس وقت ہندوستان تمدن کی کتنی بلندی پر پہونچ چکا تھا، اگر قدیم ہندوستان پر مبصرانہ نظر ڈالی جائے تو یہاں آپ کو ہر قسم کی چیز نظر آئے گی، جمہوریتیں، بادشاہتیں، شاہنشاہیاں، فلسفے، الٰہیات، یوگ، سیاسیات، نظامِ حکومت، سائنس، فنون، مذہب، شعر و سخن ہر قسم کی یادگاریں، محلات، منادر، عالیشان عمارتیں، سوسائٹیاں، روحانی علوم، دنیاوی فنون، ضابطے، رسم و رواج، تجارتیں، صنعتیں غرضکہ ایک لامتناہی فہرست ہے۔ اور ہر شعبہ میں سرگرمی عمل فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے اس دور میں آپ دیکھیں گے کہ یہ ملک ہر چیز پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی قوت تخلیق نہیں

تھکتی۔ ایک پل کے لئے دم نہیں لیتا اور نہ بیکار ہو کر بیٹھتا ہے اس کی وسعت جغرافیائی حدود کو چیر کر دوسرے ملکوں تک پھیل جاتی ہے اِس کے جہاز سمندروں کو عبور کرتے ہیں اور اِس کی دولت کی فراوانی مصر اور روم کے ساحلوں سے ٹکرا کر ان کے خزانوں کو معمور کرتی ہے۔ اِس کی نوآبادیاں مشرق الجزائر میں قائم ہوتی ہیں اور اپنے فنون اور منظومات رزمیہ سے انھیں مالامال کر دیتی ہیں۔ اس کا مذہب چین اور جاپان کو فتح کر لیتا ہے، اپنشدوں کے اصول اور بدھ مت کی تعلیمات کی بازگشت مسیح کے ہونٹوں سے سنائی دیتی ہے، ہر جگہ کیا زراعت اور کیا علوم و فنون، زندگی کی قوت نظر آتی ہے۔ لیکن نظرِ انصاف سے دیکھئے کیا مسلم طالب علم ان تمام حقائق کو دیکھنا اور انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے؟

ٹھیک اِسی طرح ایک ہندو طالب علم کی بے بصری بھی کچھ کم اندوہناک نہیں، آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر جبکہ محمد ابن قاسم نے سندھ کے ریگستانوں پر یورش کی تھی، ۱۸۵۷ء کے غدر تک اِس حقیقت فراموش طالب علم کو اِسلامی مظالم اور استبداد کے سوا اِس ایک ہزار سال کی تاریخ میں اور کوئی داستان نہیں ملتی وہ صرف جنگ و جدل اور اسلامی فتوحات کی خونچکاں داستان کو دُہراتا رہتا ہے اور صرف یہی ایک کہانی اِس کے حافظے کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ اسلامی کلچر اور تمدن نے ہندوستان کو جن نئی چیزوں سے روشناس کیا اور اتحاد تہذیب سے جس نئے کلچر کی تخلیق ہوئی اِس سے وہ یکسر غافل اور بے خبر ہی نہیں بلکہ اِس کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی اِس کے دماغ اور دل میں گنجائش تک نہیں، کتنے ہندو طلبار اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ اورنگ زیب جس کے نام سے اِن کی پیشانی سمٹ جاتی ہے اور جس کے تعصب اور تنگ دلی کی داستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکی ہے اتنا ہیبت ناک نہ تھا جس قدر عام مورخین نے اِس کا خوفناک خاکہ پیش کیا ہے۔ انگریز مورخ الفنسٹن لکھتا ہے۔

"کسی جگہ اِس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ مذہب کی وجہ سے کسی ایک بھی ہندو کو سزائے موت یا قید سے دوچار ہونا پڑا ہو یا اِس کے مال و زر پر محصول عائد کیا گیا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں کسی ایک فرد کو بھی اپنے باپ دادا کے طریقے کے مطابق علانیہ عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہو۔"

اور مسلم بادشاہ شیر شاہ سوری کے متعلق ایک یورپین مورخ کی تحقیقات ہے کہ "شیر شاہ

ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنت ہند کو رضائے عوام کے مطابق قائم کیا۔ کسی حکومت نے حتیٰ کہ حکومتِ برطانیہ نے بھی اتنی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا جتنا کہ اس پٹھان نے "

سرپی، سی، رے جن کی تاریخی حیثیت بہت بلند ہے، قوی شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ " ہندوستان میں ترقی اسلام کی تاریخ، ہندو مسلم آمیزش کی تاریخ ہے "۔۔۔۔ ہندو مسلم اتحاد، ان دو بڑی نسلوں کے خیالات، جذبات اور روایات کا ارتباط صرف سیاست تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ یہ معاشرتی تعمیر کے اندرونی گوشوں تک پہونچ گیا تھا جس کا نتیجہ وہ تحریکات ہیں جو معاشرتی اور مذہبی رنگ میں رونما ہوئیں۔۔۔۔ گرونانک، کبیر اور چیتنیہ ان دونوں کلچروں کی آمیزش کا ہی ثمر ہیں۔۔۔۔ اسلام کی جمہوری اسپرٹ نے ذات پات کے قدیم قبیح سسٹم کو توڑنے اور خود ہندو سماج میں روا داری اور بلند خیالی کی روح پھونکنے میں بڑا صالح اثر ڈالا ہے۔ علوم و فنون کے سلسلے میں زیادہ کہنا بیکار ہے۔ یونانی دماغ کا جوہر گراں مایہ انھیں مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ہندوستان میں پہونچا۔ فتحپور سیکری اور تاج کا معمار انصافاً خونخوار بھیڑئیے کے نام سے پکارے جانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔ فنون لطیفہ کی کوئی بھی ایک شاخ ایسی نہیں ملے گی جو اسلامی حکمرانوں کی ممنون احسان نہو۔ بلکہ صدہا تاریخی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رائج الوقت تاریخ نے ہندوستان کی صحیح تاریخ پیش کرنے میں مجرمانہ کوتاہی کی ہے۔ یہ چونکہ ایک مختصر مقالہ ہے اس لئے شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔

ماحصل یہ ہے کہ ہندوستانی طالب علم آزاد دماغی سرگرمی سے بے بہرہ ہے۔ تدبر اور نقاد دماغ اور شعور تحقیق پر غنودگی طاری ہوگئی ہے۔ ذہنی ارتقار، مشاہدہ اور تحقیق کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی کی مسرتیں بھی ختم ہوگئیں اور بعض ایسے فتنے کھڑے ہوگئے ہیں جو اجتماعی زندگی کے لئے سم قاتل ہیں، اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دماغی اور تنقیدی قوت بیدار ہو، خیالات میں اتنی آزادی اور لچک پیدا ہوجائے کہ مذہبی رجعت پسندی یا نسلی تعصب تلاش حق اور تفہیم حق میں سدِّ راہ نہو سکیں، جس قوم کے طلبا حق و باطل میں امتیاز کرنے کے خوگر نہ ہوں وہ کبھی اپنی پوری بلندی کے ساتھ کھڑی نہیں ہوسکتی۔ غلط تاریخ ہماری

تمام نامرادیوں کا سرچشمہ ہے لیکن صحیح تاریخ اِن نامرادیوں کو دور کر سکتی ہے۔ ہماری موجودہ علمی زندگی محض ادبی اور جذباتی ہے۔ گہری نہیں،

ہمیں ایک ایسی نئی زندگی کی ضرورت ہے جو سوشل خیالات میں وسعت پیدا کرے اور قوم کو اس تمدّن سے آشنا کرے جو گہرا اور حقائق پر مبنی ہو۔

آس کی چنگاری

اُٹھا یہ کون ساغر و مینا لئے ہوئے
مستانہ لغزشوں کا سہارا لئے ہوئے

نکلے ہیں تیری بزم سے ہم کیا لئے ہوئے (ق)
احساسِ صد شکستِ تمنّا لئے ہوئے

سینے میں ایک کشمکشِ مرگ و زندگی
دل میں توہّمات کی دنیا لئے ہوئے

اک دوش پر لئے ہوئے تابوتِ آرزو
اک دوش پر وفا کا جنازا لئے ہوئے

الزام کیوں ہے چشمِ تماشائے شوق پر
جلوے ہیں خود پیامِ تمنّا لئے ہوئے

آخر جنوں کا بھید ستاروں پہ کھُل گیا
ذرّے چمک اُٹھے غمِ صحرا لئے ہوئے

اب نازِ عاشقی کو ہے اُس دن کا انتظار
وہ آئیں میرے در پہ تمنا لئے ہوئے

پھر دل ہے اور بہاریں لٹنے کی آرزو
نوخیز بال و پر ہیں تقاضا لئے ہوئے

حدِّ تعیّنات سے کوسوں نکل گئے
میں اُن کا اور وہ مرا سہارا لئے ہوئے

ساغر حدودِ عشرت و غم سے گزر گیا
ساقی کی اک نظر کا سہارا لئے ہوئے

۱۹۳۷ء

ساغر نظامی

چمپا

(رومانی وجودیت کی آئینہ دار، ہندوستانی زبان کی ایک نظم)

مجھے دن رات مصروفِ عمل پاتی ہو لے چمپا
تو تم یہ دیکھ کر سکتہ میں رہ جاتی ہو لے چمپا
کہ شاید میں تمھیں اس غم میں دل ہی سے بھلا بیٹھا
عروسِ مادی کے گیسوؤں میں دل پھنسا بیٹھا
مگر یہ جہد مضرابِ ربابِ کامیابی ہے
عمل دیباچہ بابِ کتابِ کامیابی ہے ـــــــ مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مصروف ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بیچین ہوں چمپا!

ــــــــــــــ؟

مری چمپا میں کیوں بیچین اور بیتاب رہتا ہوں
میں کیوں مضطر مثالِ پیکرِ سیماب رہتا ہوں
میں شعلہ سا بھڑکتا ہوں خیالوں ہی خیالوں میں
ہر اک شے پر تڑپتا ہوں خیالوں ہی خیالوں میں
مسلسل حملۂ رنج و الم کیوں ہے مری چمپا!
بہارِ زندگی یوں نذرِ غم کیوں ہے مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بےچین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگین ہوں چمپا!

ــــــــــــــ؟

یہ تاروں کے کٹوروں میں شرابِ نور اے چمپا

یہ پیپل کے درختوں پر شبابِ نور اسے چمپا!
شبابِ نور سے ہر گام پر اک طور اسے چمپا!
یہ خاموشی یہ موسیقی قریب و دور اسے چمپا!
مگر تو اِس بہشت زندگی سے دور ہے چمپا!
طلسم مذہب و اخلاق میں محصور ہے چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے غمگین ہوں چمپا!

تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغموم ہوں چمپا!

———؟

تبسم نے ترے تاجِ حیاتِ جاوداں بخشا
مری ہستیٔ فانی کو ثباتِ جاوداں بخشا
زباں بخشی بیاں بخشا نظر بخشی اثر بخشا
مرقص روح بخشی اور قلب نغمہ گر بخشا

ذرا اٹھلا کے جمنا پر خراماں ہو مری چمپا!
کنول کی پنکھڑی پر آج رقصاں ہو مری چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مغرور ہوں چمپا!

تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدمست ہوں چمپا!

———؟

وہ تیرے کُندنی ماتھے پہ رنگیں چاند سا ٹیکا،
جڑا ہو آئینے میں جس طرح یاقوت کا ٹکڑا،
وہ رنگیں چوڑیوں کے گیت وہ باہوں کا دوتارا
وہ مے نوشی وہ دل کی دھڑکنیں وہ مست سناٹا

وہ ساون کی جھڑی وہ جھینگروں کے راگ اے چمپا
مرے سینے پہ لہراتے ہوئے دو ناگ اے چمپا! ——— مری چمپا

تجھے معلوم ہے میں کس لئے بدمست ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا!

؟

مری چپ ایک گہرا راز ہے اسرارِ الفت کا
زباں سے کچھ نہیں کہتا تو گویا کچھ نہیں کہتا
میں چپ ہوں اور چپ رہنا محبت کی شرافت ہے
خموشی مذہبِ الفت میں عاشق کی عبادت ہے،

مری چپ بربطِ خاموش الفت ہے مری چمپا
یہ بربطِ زینتِ آغوشِ قدرت ہے مری چمپا! — مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا

؟

جو میں بولا تو ایوانِ مذاہب گونج اُٹھے گا
لرز جائے گا کعبہ کانپ اُٹھے گی دیر کی دنیا
چھڑے گا اک مہیب انداز سے ناقوس کا نغما
اُٹھے گا شور بحر و بر سے اک اللہ اکبر کا

مری یہ مستقل چپ ایک گہرا راز ہے چمپا!
خموشی جذبۂ خاموش کی آواز ہے چمپا! — مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے خاموش ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں چمپا!

؟

یہ مذہب ہے جو دل کے ساغروں کو چور کرتا ہے
یہ مذہب ہے جو ہر نزدیک شے کو دور کرتا ہے
تجھے غمگین کرتا ہے مجھے رنجور کرتا ہے

ہماری روح کو ہر گام پر مجبور کرتا ہے
مری صابر محبّت میرا مذہب ہے، مری چمپا!
یہی رنگیں حقیقت میرا مذہب ہے، مری چمپا! ——— مری چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے بے دین ہوں چمپا!
تجھے معلوم ہے میں کس لئے مجبور ہوں چمپا!

———— ؟

اگر بے صبر ہو جاؤں، اگر آزاد ہو جاؤں
تو قلعے مذہب و اخلاق کے اک آن میں ڈھاؤں
زمینوں کو ہلا دوں اور پھینکوں آسمانوں پر
اٹھا لوں جوش میں تر لوک کو کمزور شانوں پر
مگر تیرا خیال آ کے مجھ کو روک دیتا ہے
بہکتا ہوں تو استادِ محبّت ٹوک دیتا ہے ——— مری چمپا!

———
"؟"

خدائے حُسن کو دُعا مانگتے دیکھ کر!

اس طرح وہ خاموش دعا مانگ رہے ہیں
گویا کوئی گم کردہ ادا مانگ رہے ہیں

خود خالقِ صد حُسن و ادا ہو کے وہ مخزوں
اللہ سے کیا جانیئے کیا مانگ رہے ہیں

اصغر مخزوں

دیوانگی

یہ واقعہ ہے کہ خواہ دنیا بھر کے ڈاکٹر اور حکیم اس چیز کو ایک خوفناک بیماری کہتے کہتے اسی میں مبتلا ہو جائیں لیکن میں اور میرے ہم وطن شعرار اسے ایک عطیہ قدرت ہی سمجھتے رہیں گے۔ یقین نہ آئے تو ہم میں سے کسی ایک کی غزل اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ کوئی مجنوں کی دیوانگی پر رشک کر رہا ہوگا اور کوئی فرہاد کی وحشت پر فخر، کوئی اپنے آپ کو دیوانہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہوگا اور کوئی خلل دماغ کی ایک ایک علامت اپنے اندر گنا کر رکھدیگا، یہ دوسری بات ہے کہ ہم لوگ بجائے آگرہ اور بریلی کے مخصوص مہمان خانوں کے بازاروں میں چلتے پھرتے، دفتروں میں کام کرتے، اور مشاعروں میں عجیب عجیب سُر نکالتے دکھائی دیتے ہیں۔ اِس بات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس عطیہ قدرت کی مختلف قسمیں اور درجات ہیں۔ اگر انھیں گاؤدُم طریقہ پر لکھا جائے تو ترتیب یہ قرار پائے گی۔

بیوقوفی، حماقت، چُغد پن، خبط، مراق، سنک، پاگل پن، وحشت اور جنون۔ آیئے اِن کی ماہیت پر علیحدہ علیحدہ غور کریں۔

بیوقوفی:- یہ چیز بہت عام ہے اور ذرا سی غلطی پر خواہ وہ ٹنکچر آیوڈین اور جوارش جالینوس کے صحیح ہجے بھی نہ جانتا ہو فوراً دوسرے کے لئے تشخیص کر دیتا ہے

حماقت:- بیوقوفی کی بڑی بہن ہے اور اس سے ایک بڑی حد تک مشابہ، فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ بے وقوفی کا اُس ہستی پر اطلاق ہوتا ہے جس میں عقل کی کمی ہو اور حماقت کا اُس پر جس میں عقل تو ہو لیکن کسی قدر معطل،

چُغد پن:- بھی اِن دونوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ اگر حماقت میں تھوڑا سا سیدھا پن اور شامل کر دیا جائے تو وہ چُغد پن ہو جائے گا۔ جس شخص کو خوش قسمتی سے چُغد پن حاصل ہو جائے وہ جانوروں سے زیادہ مشابہ

ہو جاتا ہے۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُس کے سر پر سینگ دکھائی دینے لگتے ہیں یا پیروں
میں پانچ اُنگلیوں کی جگہ ایک سُم، بلکہ اُس کی سیرت اِنسانوں سے زیادہ حیوانوں سے
ملنے لگتی ہے اور آپ اُس کی ہر حرکت پر چھوٹتے ہی کہہ دیتے ہیں۔ اُلّو۔ گدھا۔ مہربانی فرما کر
اِس پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہ کیجیے کہ آخر کسی چغد قسم کے انسان کو اُلّو یا گدھا ہی کیوں
کہا جاتا ہے۔ بلی کیوں نہیں کہہ دیتے۔ کبوتر فرما دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ حالانکہ اُلّو اور گدھا
دونوں صاحبان اپنی فیلسوفیت اور عقل و دانش کے لحاظ سے سب جانوروں میں برتر
تسلیم کرلیے گئے ہیں، یہ گتھی بہت پیچیدہ ہے اور عرصۂ دراز سے یونہی چلی آتی ہے۔ جناب اُلّو
کو تو چنیا بیگم کے عشاق کی طرح دن بھر اونگھنے یا سونے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ البتہ سُنا
گیا ہے کہ ایک دفعہ گدھے صاحب کو حضرت اِنسان کے اِس چغدپن پر نہایت سخت قسم کا
غصّہ آگیا۔ جس کے ثبوت میں آپ نے ایک دُبلے پتلے اِنسان کے جو انھیں آسانی سے قریب ہی
مہیّا ہوگیا تھا پوری طاقت سے ایک دولتّی رسید کردی۔ اب بتائیے کہ وہ آدمی کا بچّہ جو
اپنی مادر محترمہ یا شفیق اُستاد کے ایک دو ہنٹر کی تاب نہ لاسکتا ہو، جناب کی دولتّی
نوش کرکے کتنا ناچا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس غریب کو فوراً ہسپتال بھیجا گیا اور آپ کو غالباً
"کانجی ہوز"، وہاں کسی چغد کو جو چغدپن سوجھا تو آپ کا بیان لے ڈالا۔ آپ نے نہایت
اطمینان سے گلا صاف کرکے خاص بیرسٹرانہ انداز میں فرمایا کہ "ہمارے نازک نازک کان
اِنسان کے اِس چغدپن سے پک گئے کہ وہ جب اپنے کسی ہم جنس کی حماقت کا علانیہ اظہار کرنا
چاہتا ہے تو اُسے گدھا" کہہ دیتا ہے اور جب ہم سے زیادہ ضبط نہ ہوسکا تو ہم نے محض
بطور احتجاج اِس آدمی کے ایک ہلکی سی لات ماردی تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت انسان
کو اِس چغدپن سے روکنے کے کام آوے اور چونکہ یہ واقعہ محض ایک اشتعال کا نتیجہ ہے اِسلئے
بموجب دفعہ فلاں قانون فوجداری گورنمنٹ ہند ہم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا"، لیجیے
چھٹی ہوئی۔ اب یہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ انھیں اِس جرم میں کیا سزا بھگتنی پڑی۔ البتہ
قیافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اِنسان نے لاجواب ہوکر اُنھیں نہایت عزت و آبرو
کے ساتھ بری کردیا۔

خبط:- جُنون سے ایک درجہ اور ترقی کی جائے تو خبط کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اِس درجۂ عالیہ پر فائز ہوتے ہی اِنسان کو کسی خاص شئے سے زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور تشخیص کرنے والے فوراً کہہ دیتے ہیں "خبطی ہو گیا ہے" خبط ہر شئے کا ہو سکتا ہے۔ گھوڑ دوڑ کا خبط، ٹکٹ جمع کرنے کا خبط، اور زیادہ اونچے پہونچے تو مضمون نگاری کا خبط، اور نوالی کی ترنگ میں آئے تو مقدمہ بازی کا خبط، خبطی ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی محبوب شئے کو دنیا بھر میں انتخاب کر لیتا ہو بلکہ اُس کے مقابلے میں وہ دنیا کی تمام چیزوں کو خواہ وہ اُس سے کتنی ہی بہتر اور سود مند کیوں نہ ہوں لچر قرار دے دیتا ہے۔ کسی گھوڑ دوڑ کے خبطی کے سامنے آپ کوئی عمدہ سے عمدہ مضمون پڑھنے لگئے اُس پر فوراً دیوانگی کا دورہ پڑ جائے گا اور وہ اپنے خبط کے ثبوت میں آپ کے ہاتھ سے مسودہ چھین کر بھاگنے سے بھی دریغ نہ کرے گا یا کسی پُرانی تہذیب کے بزرگ کے سامنے موجودہ سُر الاپنے لگئے تو فوراً لاحول پڑھ کر آپ کے اِس طرح پیچھے پڑ جائیں گے۔ گویا آپ جیسے شیطان نما اِنسان سے بدلا لینا اُن کا مذہبی، اخلاقی اور تمدنی فرض ہے اکبر الہ آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ پڑھ کے بچّے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مراق:- آپ سے تعارف کیجئے۔ آپ بھی ایک عطیۂ قدرت ہیں اور خبط صاحب کے رشتے میں بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ آپ میں اور خبط میں صرف اتنا فرق ہے کہ خبط سے سرفراز ہونے کے بعد اِنسان کو ایک خاص شئے کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جچتی۔ لیکن آپ سے سابقہ پڑنے کے بعد اُس خوش نصیب کو کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں رہتا بس ایک دھُن ہر وقت سوار رہتی ہے۔ دیوانگی کے اِس درجہ پر آکر اِنسان کھانے پینے، سونے جاگنے اور دوسرے حوائج ضروری کی فضول پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ فطرت نے بالکل ہی مجبور کر دیا تو خیر، ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں۔ کھانا مِل گیا کھا لیا، نہ ملا مانگنے کی ضرورت نہیں۔ نیند نے مجبور کر دیا تو جہاں سینگ سمائے پڑ کر سو رہے۔ بچھونا کرنے کی نہ ضرورت نہ

فرصت، ایسے لوگوں کو بے تکلف مراقی کہہ دیا جاتا ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اس کا بُرا بھی نہیں مانتے۔ سر کی ایک ہلکی سی جنبش یا لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ اس خطاب کے شکریہ میں پیش کردی اور بس۔ البتہ یہ مراقی لوگ ہمیشہ بیکار ہی نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرزد ہو جاتے ہیں کہ اچھے اچھوں کو رشک ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ مراقی جنھیں لیڈری کا مراق ہوتا ہے عوام الناس کے بہت کام آتے ہیں مینڈکوں کی طرح ان کی پیداوار کا بھی ایک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ لیڈری کے مراقیوں کی بہار دیکھنی ہو تو کسی الیکشن کے منتظر رہئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں جوتیاں چٹخاتے نظر آ جائیں گے۔ نہ کھانے کی خبر، نہ پینے کا ہوش، بس قوم کی فکر ہے۔ بدھّو نان بائی کا بچّہ مر گیا آپ جنازہ اٹھائے سب سے آگے آگے۔ کلّو حجّام کی ماں کا تیجا ہے۔ آپ انتہائی شورٹ ہینڈ سے چنے پڑھ رہے ہیں۔ خیراتی بلّیہ دار کے ولیعہد کی ختنہ ہوئی ہے آپ شیرینی کی طشتریاں تقسیم کر رہے ہیں۔ دولت سرا میں خواہ ملیریا نے مورچہ جما رکھا ہو، لیکن قوم کی خدمت بہر حال فرض ہے۔

باقی

صادق حسین قیصر میرٹھی

دھنک

کرنوں کے چھوؤں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری
جوبن پر ہے رنگ راج کی رنگین راجکماری
چندری اپنی اُڑا رہی ہے برکھا رُت کی کنواری

اندر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رہ رہ کر پچکاری
یا کر کے اشنان لکشمی سُکھا رہی ہے ساری

ساغر نظامی

بہشتِ گم شدہ

(حکیم سیّد احمد رشید زیبا فیض آبادی)

شبابِ شوق تھا اُمید کی جوانی تھی
شروعِ حسنِ محبّت کی زندگانی تھی

زبانِ گُل کی خموشی بھی نغمہ خوانی تھی
ہر ایک غنچے پہ چھائی ہوئی جوانی تھی

فضا تمام بہشتِ جمالِ معصومی
کہ مایہ دارِ حجاباتِ لن ترانی تھی

گھٹائیں آتی تھیں پیغامِ میکشی لیکر
یہ بادہ خوار پہ ساقی کی مہربانی تھی

بہارِ صبح تصدّق، وہ کوہسار کی شام
نفس نفس میں جہاں عمرِ جاودانی تھی

نسیمِ صبح جو گاتی تھی سرمدی نغمے،
شراب ریز تھی، پُرکیف تھی، سہانی تھی

اُڑا رہی تھی صراحی سے جام میں کوئی شئے
بہت لطیف سی، ہلکی سی، ارغوانی تھی

بہم تھے شورش و تسکیں کے ایک جا منظر
اِدھر نگاہِ محبّت اُدھر جوانی تھی

ستارے عارضِ افلاک پر چمکتے تھے
یہ تمام کی ذرّوں پہ ضوفشانی تھی

نظر نظر میں لطافت، نفس نفس میں بہار،
تخیّلات کہیں اک جنّتِ معانی تھی

برس رہی تھیں گھٹائیں تری نوازش کی
کہ ذرّے ذرّے میں سرمستیٔ جوانی تھی

تجلیّات کا تھا اک ہجوم نظروں میں
مری نگاہ بھی فردوسِ غیر فانی تھی

حریمِ قدس کے پردے اُٹھے ہوئے تھے تمام
میں باریابِ محبت تھا کامرانی تھی

نیازِ عشق کے آگے جھکا ہوا تھا حسن
کہ داستانِ محبت تری زبانی تھی

نظر نظر تھی تری التجائے پیہمِ عشق
نفس نفس میں ترے سوزشِ نہانی تھی

حسین جسم پہ تھا لرزشِ خفی کا اثر — شرر آنکھوں سے پیہم گہر فشانی تھی
خوشا وہ عہدِ مسرّت زہے سرورِ خیال — نشاطِ کیف تھا، راحت تھی شادمانی تھی
کہاں سے لائیے وہ زندگی کیف و جمال — وہ زندگی نہ تھی اک خواب تھا کہانی تھی

بیا کہ تازہ نما داغ ہائے سینۂ مَن
بیا کہ غرقِ مسرّت شود سفینۂ مَن

پوجا

میں پجاری ہوں پجاری !

:- جب میں ابھی بچّہ تھا چُپ چاپ مریض، سنجی اور میرے ماں باپ بچپن سے گھبرانے تھے تو میں اپنی نانی اور خالہ اور نانا سے لپٹا رہتا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور مجھے ہم عمروں میں آوارہ گردی کی اجازت نہ ملی تو میں اپنی آیا اپنی الماری اور اُس کے ایک ایک کونے سے چپٹا رہتا

جب میرے دماغ میں ا، ب، ت ڈالی گئی اور خشک کتابوں کی زنجیروں نے مجھے جکڑ لیا تو میں نے مذہب و شاعری سے ربط پیدا کر کے ان کو اپنا تنہا رازداں بنا لیا۔

میں جو پجاری ہوں ہمیشہ پجاری ہی تھا۔

برسوں میں اپنے دل کے نگارخانے کو آراستہ و پیراستہ کرتا رہا کہ شاید کوئی اِس کی سیر کو آنکلے۔ لیکن اِس خاموش گنبد میں صرف تنہائی کی آوازیں رات دن اپنا سر ٹپکتی رہیں تو جب اور کوئی بُت نہ ملا تو میں اپنے رنج والم ہی کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر یُوں گر پڑا کہ آسمانوں پر ہلچل مچ گئی کہ دیکھنا، لینا، یہ پجاری ہی پجاری !!

پھر قسمت نے اور چال چلی اور میری فطرت نے ایک اور فریب کھایا۔ کسی کی کمائی ہوئی دولت میری ہو گئی جس نے مجھے اپنی تنگ آغوش میں لے لیا۔ تو میرا کیا تھا میں گوشہ گیر اِس سے بھی ہمکنار ہو گیا پھر جب میں نے ایک رفیق زندگی کو حاصل کیا تو محض اِس کی خوشی اپنا معمول ہو گیا اِس کے نام پر ایک مندر کھڑا کر دیا لیکن شاید ایک پیکر محبّت مجھ بیوفا پجاری کو کافی نہ ہوئی تو میں نے مندر کے نزدیک و دور اپنے تصورات و توہمات کا ایک بے پایاں باغ و صحرا پھیلا دیا جس میں خیالی پھولوں کی اور کبھی کبھی کانٹوں کے ذرّوں کی پوجا میں نے بڑے شد و مد سے شروع کر دی۔ میں جو ہمیشہ ایک پجاری تھا۔ اب بھی ایک پجاری ہوں ! (میاں بشیر احمد بی۔ اے آکسن)

عالیجناب نواب میر یوسف علی خان بہادر سالار جنگ ثالث

اِس رفیع الشان خاندان کا سلسلہ اویس قرنی رضؓ سے ملتا ہے۔ اِن کی دسویں پشت میں ادیس ثانی گزرے ہیں جو مدینہ میں اوقاف کے متولی تھے اور یہ اپنے فرزند محمد علی کو لیکر وارد ہندوستان ہوئے۔ اور بہ زمانۂ عادل شاہ بیجاپور میں آکر سکونت اختیار کی۔ اِس خاندان کے اکثر اراکین نے اِس ریاستِ ابدمدت کی مدار المہامی جیسی گرانمایہ خدمت انجام دین، آج دکن میں صرف ایک یہی عظیم القدر، قدیم خاندان ہے۔ جس کے تمام معزز ارکان نے اپنی ذاتی شجاعت، دلیری، لیاقت اور دولت سے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے کہ جس کے باعث ہمیشہ موردِ الطافِ خسروانہ رہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اعزاز و اکرام اِس ریاستِ ابدمدتؐ میں اِس جلیل القدر اور رفیع الشان خاندان کو حاصل ہیں وہ دوسروں کو کم ہیں۔

ہمارے معزز صاحب تذکرہ نواب میر لائق علیخان مرحوم منیر الدّولہ عماد السلطنت، سالار جنگ ثانی (سابق مدار المہام) کے اکلوتے فرزند نواب میر سعادت علیخان مرحوم منیر الملک غیور جنگ، شجاع الدّولہ کے حقیقی بھتیجے اور نواب میر تراب علیخان مرحوم مختار الملک، سر سالار جنگ اوّل جی۔ سی۔ ایس۔ آئی (سابق مدار المہام) کے پوتے ہیں۔ آپ سالار جنگی خاندان عالیشان و خانوادۂ درگاہ قلی خان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ولادت یوم جمعہ ۴ شوال المکرّم ۱۳۰۶ھ م ۱۳ جون ۱۸۸۹ء م ۶ امرداد ۱۲۹۸ ف میں ہوئی ــــ ولادت کے ایک ماہ بعد آپ کے عمّ بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اِس لئے حضور نظام (غفران مکان) نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ آپ کی کمسنی کی وجہ سے آپ کی جاگیر اور جائداد و املاک زیر نگرانی سرکار لے لی گئی اور خاص طور پر معتمد صاحب مالگذاری سرکار عالی اِس معزز اسٹیٹ کا انتظام کرتے رہے

۱۳۱۶ھ میں بتقریب جشن سالگرہ مبارک اعلیٰ حضرت غفران مکان نے آپ کو خطاب خان بہادری وسالار جنگی ثالث و منصب دو ہزاری و پانصد سوار و علم و نقارہ سے سرفراز فرمایا۔ آپ نے اولاً بطور خانگی لائق استادوں سے گھر پر اور بعد ازاں مدرسۂ عالیہ (اس مدرسہ کی ابتدا سر سالار جنگ اوّل مرحوم کے ہاتھوں محض امراء و روساء کے بچوں کی تعلیم کے لئے ہوئی تھی) میں شریک ہو کر اعلیٰ پیمانے پر تعلیم حاصل فرمائی، آپ علوم مشرقی و مغربی میں لیاقت تامہ رکھتے ہیں، اردو، فارسی عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں مثل اہل زبان کے گفتگو فرماتے ہیں۔ آپکی تحریر اور تقریر اردو، فارسی اور انگریزی نہایت شستہ اور دلچسپ ہوتی ہے۔ توجہ ذہانت آپ کا زمانۂ تعلیمی بہت اچھا گزرا۔ الحاصل آپ لیاقت و قابلیت میں اپنی آپ نظیر ہیں، شکار، نیزہ بازی، شہسواری پولو، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور دیگر مردانہ کھیلوں میں بھی آپ کو مشق کرائی گئی۔ ان کھیلوں میں بھی آپ نے مہارت تامہ حاصل فرمائی اور آپ کو بیحد دلچسپی بھی ہے۔ خصوصاً پولو میں آپ کو اچھی مشق حاصل ہے۔ آپ کی ٹیم موسوم بہ "سالار جنگ" اپنے نمایاں کھیل کی وجہ سے آج تمام ہندوستان میں مشہور و معروف ہے۔ آپ کی جاگیر کا رقبہ (۱۴۸۰) مربع میل یعنی ہز ہائنس مہاراجہ پٹیالہ کی ریاست کی برابر ہے، اجنٹا کی کانیں اور مشہور عالم غار آپ کی جاگیر میں واقع ہیں، جاگیر کی آبادی ۱۹۱۱ء میں دو لاکھ اور کئی ہزار تھی، علاقہ مقبوضہ میں کئی عدالتیں اور جیل ہیں، جاگیر کی سالانہ آمدنی علاوہ دیگر جائداد کے بارہ لاکھ اور پچاس ہزار ہے۔ آپ ان جاگیرداروں میں ہیں جنھیں فوجی، عدالتی، کوتوالی وغیرہ کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں آپکی جاگیر واگزاشت ہوئی۔ اسی سال راجہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت سرکار عالی کے رخصت کے سلسلے میں تین سال کے لئے آپ مدار المہام مقرر ہوئے گو آپ منصرم تھے، لیکن آپکے اختیارات مستقل مدار المہام کے برابر تھے اور ۱۹۱۴ء میں آپ کو مستقل مدار المہام مقرر فرما کر اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے آپ کو ایک لاکھ کا گراں بہا خلعت عطا فرمایا۔ اور دسمبر ۱۹۱۴ء میں آپ نے چھ ماہ کی رخصت پر خدمت سے علیحدگی اختیار کی۔ آپ نے ہندوستان، عراق، عرب ایران اور یورپ کے تمام شہروں کی سیر فرمائی۔ نیز دو مرتبہ یورپ تشریف لے گئے۔ آپکا یورپ کے سفر کو جانا گو سیر و سیاحت پر مبنی تھا لیکن آپ نے ان سفروں میں جو زبردست معلومات حاصل

فرمائی وہ حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ۱۳۴۸ھ میں عراق عرب، مصر و شام، بیروت، بیت المقدس اور ایران کا سفر فرمایا اور زیارت ائمہ علیہم السلام سے مشرف ہوئے۔ حال میں اور آخر ۱۳۵۲ھ میں آپ نے علاج کی غرض بار سوم یورپ کا سفر فرمایا اور بصحت تمام ماہ دوم ۱۳۵۳ھ میں وطن واپس آئے آپ کو اخبارات و رسائل اور کتب بینی کا نہایت شوق ہے۔ چنانچہ صدہا رسائل اور اخبارات کے آپ سرپرست اور معاون ہیں شمالی اردو زبان کی مشہور اور مستند کتاب **بادۂ مشرق** مجموعۂ کلام حضرت ساغر نظامی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوا ہے۔ ——— آپ علم دوست، سلیم الطبع، سیر چشم، دریا دل شریف پرور، کرم گستر، خوش اعتقاد، الوالعزم اور عالی ہمت امیر ہیں۔ آپ کے الطاف و عنایات اکثر علماء، شعراء، ادبا، فقراء اور سائرین کے حال پر مبذول رہتے ہیں اور آپ کے در دولت سے ہزارہا اشخاص فیض یاب اور مستفیض ہوتے ہیں۔ سخاوت کو آپ پر ناز ہے کیوں نہ ہو آپ نواب میر تراب علی خاں مرحوم کے چشم و چراغ اور نواب میر لائق علی مرحوم حاتم وقت کے صاحبزادہ ہیں۔ آپ کی شگفتہ مزاجی، خوش خلقی اور فیاضی میں اپنے دادا نواب میر تراب علی خاں مرحوم سالار جنگ اوّل کے قدم بقدم ہیں۔

آخر میں ہم خوش اعتقادی کے ساتھ آپ کی عمر و دولت، عزت و اقبال و صحت کے لئے بارگاہ صمدیت میں بصد خلوص دعا کرتے ہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نظرِ کرم کی فراوانیوں پہ پڑتی ہے
پھر اپنے دامنِ خالی کو دیکھتا ہوں میں

ساغر نظامی

"تم اب بھی یاد آتے ہو"

تم اب بھی یاد آتے ہو بہارِ منظر بن کر
تم اب بھی دل میں رہتے ہو زسرتاپا اثر بن کر
تم اب بھی دل پہ چھا جاتے ہو انوارِ قمر بن کر
میں سچ کہتا ہوں رہتے ہو حجاباتِ نظر بن کر

دفورِ چشم تر بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

یہ مانا غیر کے گھر گلفشاں بھی ہو گئے ہو تم
یہ مانا ماورائے جسم و جاں بھی ہو گئے ہو تم
یہ مانا میری نظروں سے نہاں بھی ہو گئے ہو تم
دلِ وحشی پہ گو نامہرباں بھی ہو گئے ہو تم

مگر جانِ خلش بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

نہ میرے دل میں ہے ارمان و شوقِ زندگی باقی
نہ گلزارِ تمنا میں ہے کوئی دل کشی باقی
نہ امیدوں کے چہرے پر کوئی رونق رہی باقی
اگر باقی ہے تو جذبات کی ہے بیکسی باقی

مگر ہمرازِ دل بن کر ــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

نہ دریا کی ترنم زائیوں میں چین ملتا ہے

نہ دشت و کوہ کی تنہائیوں میں چین ملتا ہے
نہ اہل عقل کی دانائیوں میں چین ملتا ہے
نہ اپنے درد کی گہرائیوں میں چین ملتا ہے
مگر تسکین جاں بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

اگرچہ قوّتِ قلبِ حزیں پر اپنی نازاں ہوں
میں اپنی حالت پُر درد پر ہر چند خنداں ہوں
تمھیں گو بھول جانے کیلئے ہر وقت کوشاں ہوں
مگر میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری پہ حیراں ہوں
طلسمِ دلکشی بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

تمھاری یاد میں رونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
یہ دامانِ الم دھونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
تمھاری راہ میں کھونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
دعائے مستقل ہونے سے گو حاصل نہیں کچھ بھی
مگر اشک و دعا بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

میں اپنی آرزو کی زندگی کو تلخ پاتا ہوں
میں اپنے آنسوؤں کی نہر میں خود ڈوب جاتا ہوں
در و دیوار کو اب اپنا افسانہ سناتا ہوں

میں اپنی روح کی خلوت میں اب روتا ہوں گاتا ہوں
سراپا ہمنشیں بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

پریشاں ہو کے جب بستی سے کوسوں دور جاتا ہوں
جب اپنے دل ہی میں روتا ہوا مجبور جاتا ہوں
شرابِ کیفِ غم سے ہو کے جب مخمور جاتا ہوں
جب اپنے درد کی کیفیتوں میں چور جاتا ہوں
تو میرے ہم سفر بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

قمر ہوتا ہے جب بزمِ فلک میں انجمن آرا
فضا ہوتی ہے جب نغماتِ سحر افگن کا گہوارا
سرور و کیف میں جب ڈوب جاتا ہے چمن سارا
فنا جب ٹوٹ کر ہوتا ہے گردوں پر کوئی تارا
شکستِ سازِ دل بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

دکھا دیتا ہے دل جب کوئی طعنے کی چبھن بنکر
نظر آتی ہے دوشیزہ کوئی جب یاسمن بنکر
مٹا دیتی ہیں جب مجبوریاں دار و رسن بنکر
تمنا دل میں آتی ہے محبت کا کفن بنکر
تو میرے نوحہ خواں بن کر ـــــ تم اب بھی یاد آتے ہو

تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

مرے جذبات پر جب سارا عالم تنگ ہوتا ہے
دلِ پُرغم جب آمادہ برائے جنگ ہوتا ہے
زمانہ جب مرے سر کے لئے اک سنگ ہوتا ہے
مری ہستی پہ جب طاری فنا کا رنگ ہوتا ہے
تو پیغامِ سکوں بن کر —— تم اب بھی یاد آتے ہو
تم اب بھی یاد آتے ہو، تم اب بھی یاد آتے ہو

خلش صدیقی بی، اے لکھنوی

ماضی

تو اپنی معصوم ابدیت کی گود میں جھلمل جھلمل کرتا نظر آتا ہے تیرے عہد کی مسرتیں مجھے اپنی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہ میرا دامن چھوڑ کر مجھے میرے حال کے گرداب میں جس کے چکر کی عمر بقدر یک لمحہ ہے غوطہ زنی کے لئے چھوڑ دیتی ہیں۔

اے ماضی تیرے عہد کے سب زخم پھول معلوم ہوتے ہیں اور مستقبل کی مسرتیں زخم کاری کی موہوم اُمیدیں، جب تو میرے جسم کو چھوتا ہے تو مجھے آرام لذت اور طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ جب حال مجھ سے مس کرتا ہے تو میں ایک جامد شئے معلوم ہوتا ہوں اور جب مستقبل اپنے بازو میرے شانوں سے مس کرتا ہے تو میں ایک طلسم لاینحل سے ہمکنار ہو جاتا ہوں۔ یہ طلسم مسرت وغم، کامیابی و ناکامی، موت و زندگی۔ ارتقا و پستی، حسن و عشق، نامرادی و شادکامی، گلشن و صحرا اور عدم و وجود کا ایک ہنگامہ بن کر مجھ کو محیط ہو جاتا ہے۔ اے ماضی میرا حال دیکھ اور اپنی گود میں مجھے ابدالآباد کے لئے چھپا لے۔

ساغر

شباب کی فتح

(سید محمد یحییٰ صاحب میرٹھی)

"کائنات اپنے پیدا کرنے والے کو معلوم کرنے میں قاصر رہی ہے" یہ الفاظ کہنے کے بعد جمشید پھر ایک گہری فکر میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں کے اندر تمام عالم پر شب کی تاریکی چھا گئی۔ چاند روپوش تھا۔ لیکن خلائے ارغوانی میں تاروں کی حکومت قائم ہو گئی۔ آسمانی دیوتاؤں کا رہبر مشتری اپنی تمام درخشانیوں کے ساتھ سنہری چادر خود اوڑھے ہوئے برآمد ہوا۔ جمشید مستغرق تھا۔ یکایک موسم گرما کی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے باغ میں یاسمین اور ملکۂ شب اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے جمشید تک پہونچے اور اس کو بیدار کر دیا۔

قدرت کی ہزار زبانیں اس سے ہمکلام ہونے کے لئے بیقرار تھیں، ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ آج جمشید کے کفر کو توڑ کر اس منکر الٰہی کا دل حقیقت الٰہیہ سے منور کر دیا جائیگا

"پیدا کرنے والا۔ علت العلل۔ سبب اوّل، یہ سب اصطلاحات ظنی ہیں۔ انسان اپنے جہل کا اعتراف کرتا ہے۔ اسباب کا ایک سلسلہ خود اپنی عقل سے بنایا اور جب ابتدا معلوم نہ کر سکا تو ایک نقطہ پر لاکر انتہا کر دی۔ اصل مقصد دل کو اطمینان بخشنا تھا۔ اس لئے انسان کے تخیل نے خدا کا تصور کیا"

رات کی تاریکی کے ساتھ جمشید کے شکوک بڑھتے جاتے تھے۔ فضا کی خاموشی نے قلب و دماغ کو یکسوئی عطا کر دی۔ اس لئے خیال و فکر الٰہیات کے تمام گوشوں پہ نظر حقارت ڈالتے ہوئے الحاد و زندقہ کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ لے جا رہے تھے۔

جمشید کی عمر اس وقت ۲۲ سال سے زائد نہ ہوگی۔ میانہ قد، خوبصورت آنکھیں، شباب کی سرخی اور قوت ہر عضو بدن سے ٹپک رہی تھی۔ چہرے پہ متانت، انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ سے زندگی کو سنجیدہ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ تحصیل علم میں فلسفہ کا شائق تھا اور باوجود کئی مضمونوں میں ایک ہندوستانی یونیورسٹی کی آخری ڈگری حاصل

کر چکا تھا۔ لیکن ہنوز قدیم وجدید فلسفہ کے نظریات اِس کے پیش نظر رہتے تھے اور اِن پر غور وفکر کیا کرتا تھا۔ طبیعت اِس نوعمری میں اِس درجہ دقیق ہو چکی تھی کہ اشیاء کا ظاہری حسن اِس کے نزدیک ایک بے معنی چیز تھا۔ اِس کے استغراق وتفکر کو کسی کے پاؤں کی آہٹ نے ختم کر دیا۔ جمشید نے سر اُٹھایا اِس کی پشت کی طرف دو جھاڑیوں کے درمیان باغ کی ایک روش پر ایک جوان لڑکی برقی مشعل ہاتھ میں لئے خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ آنکھیں کسی چیز کو تلاش کرنے میں مشغول تھیں۔ جمشید نے لڑکی کو دیکھا اور بادل ناخواستہ کسی قدر بھاری آواز سے اپنی جائے نشست کی طرف لڑکی کو آنے کی دعوت دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لڑکی۔ " بیوقوف ! کیا اپنی تمام عمر اِن چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے میں صرف کر دے گا جو تیری عقل وادراک سے بہت بلند ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جمشید! ذرا نظر اُٹھا کر دیکھ۔ کائنات کا ہر ذرّہ تجھے پیغام مسرّت پہونچا رہا ہے، زہرہ اپنے حسن وجمال کو تیرے باغ کے تالاب میں دیکھ رہی ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ میں فطرت کا ایک شاہکار ہوں، "۔

جمشید نے جو اِس مداخلت سے کسی قدر چیں بر جبیں تھا۔ برجیس، کی طنزیہ خطابت کو ٹھنڈے دل سے سُنا۔ اور پھر کچھ سوچ کر کھڑا ہو گیا۔ فلسفہ کے خشک اور دقیق دماغ نے جمشید میں رقیق جذبات کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

برجیس ایک ہمسایہ لڑکی تھی۔ معیار حُسن کے لئے کوئی کلیّہ نہیں ہو سکتا۔ انفرادی ذوق اپنا اپنا معیار جداگانہ رکھتا ہے لیکن برجیس بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ موجودہ زمانہ کی سوسائٹی نے اُس کو ضرورت سے زیادہ شوخ بنا دیا تھا۔ اِس کی تعلیم معمولی تھی لیکن خلقی ذہانت اور تعلیم یافتہ گھرانے کی تربیت نے باقاعدہ تحصیل علم کی کمی کو پورا کر دیا تھا اور اِس کی معلومات عام مسائل پر اتنی کافی تھی کہ کسی علمی صحبت میں وہ مجبور اور عاجز ثابت نہیں ہوتی تھی، جمشید ایک خشک مزاج فلسفی تھا۔ اور اِس خشک انداز کے ساتھ برجیس کا دوست تھا۔ لیکن برجیس کے عمیق ترین گوشۂ دل میں جمشید کے لئے ایک رقیق جذبہ موجود تھا جس کو وہ کبھی کبھی نادانستہ الفاظ میں ظاہر کر دیا کرتی تھی

برجیس انتہاری نرگسیت بڑھتی جاتی ہے۔ فطرت کا شاہکار، ! فطرت ہے کیا چیز؟

کبھی تم نے غور کیا" جمشید نے متانت کے ساتھ کہا۔

"تمہارے دماغ کے سوا ہر چیز فطرت ہی فلسفہ کے دور از کار مباحث نے تمہارے دماغ کو البتہ غیر فطری بنا دیا ہے۔ جمشید! کیا تم محبت سے بالکل نا آشنا ہو؟" برجیس نے سوال کیا۔

میں ہر اُس چیز سے نا آشنا ہوں جو حقیقت سے دور ہے۔ محبت اور نفرت دو جذبے ہیں، دونوں ناپائدار۔ تجربہ سکھاتا ہے کہ محبت کے مقابلے میں نفرت زیادہ پائدار ہوتی ہے" جمشید نے جواب دیا اور پھر کچھ سوچ کر برجیس سے پوچھا "برجیس! تم نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟

"محض اس لئے کہ تم کو الحاد کے قعر عمیق میں گرنے سے روکوں" برجیس نے کہا۔

جمشید نے یہ الفاظ سُنے اور مسکراتے ہوئے برجیس کے داہنے شانے کو پکڑ کر کہا۔

"کس قدر خوبصورت فریب ہے۔ حقائق اشیاء کا معلوم کرنا الحاد ہے؟ برجیس کائنات کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ اس کو کس نے بنایا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ انسانی فکر نے ارتقار کے مختلف مدارج میں مختلف نظریئے پیش کئے ہیں۔ تصورِ الٰہی ابتدا میں ہیبت ناک قوتوں تک محدود تھا۔ پھر خدا کو سزا اور جزا کا آلہ بنایا گیا۔ بالآخر انسانی تخیل کی بلند پروازیوں نے جلال وجمال قدرت وکمال کا ایک نادرالوجود اور ما فوق الادراک تصور پیش کیا۔ ایک طرف یہ وجود ما فوق الادراک ہے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ اس کو تسلیم کرو۔ کیوں تسلیم کرو؟ اس لئے کہ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس پر کیوں ایمان لاؤ؟ محض اس لئے کہ چند مصلحین نے کہا ہے کہ حقیقت یہی ہے۔ وہ انسان جو ایک ذرّے کی ماہیت سے واقف نہیں وہ ایسے وجود کی ذات وصفات کا پتہ دیتا ہے جو جملہ کائنات کی خالق ہے۔ آخر اس عاجز انسان نے اس زبردست حقیقت کو کیونکر معلوم کیا۔ جبکہ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ وجود خداوندی ما فوق الادراک ہے۔ برجیس دوسروں کی طرح تم بھی اس خوشنما فریب میں مبتلا ہو۔ محبت بھی اسی سلسلے کی ایک نازک کڑی ہے۔ تمہاری شوخ ادائیں اور ہوا میں اُڑتے ہوئے لمبے لمبے گھنے بال اس محبت کی دعوت دے رہے ہیں جو انسانی زندگی کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ کتنے انسان ہیں جنھوں نے فلسفۂ محبت کے ہاتھوں اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ برجیس رقیق جذبات بالآخر بھاپ کی طرح اُڑ جاتے ہیں اور پھر زندگی کی افسردگی تمام

قوائے عمل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ تم فطرت کا ایک کھلونا ہو۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اپنے مقصد حیات کو خیرباد کہہ کر تمھارے ساتھ کھیلنا شروع کر دوں"؟

اِن آخری جملوں نے جہاں پرجبیں کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا وہاں اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ جمشید نے اس کی توہین کی ہے۔ دماغ میں ایک تلاطم برپا تھا لیکن پرجبیں نامہربان ہونا نہیں چاہتی تھی۔ آج ارادہ کر کے آئی تھی کہ جمشید پر فتح حاصل کرے گی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ جمشید کے الفاظ نے گویا تودۂ بارود میں آگ لگا دی۔ وہ دورِ حاضر کی مہذب لڑکی تھی۔ قدیم زمانہ کی بزدلانہ شرم و حیا اس کے نزدیک مردوں کے سامنے اعترافِ شکست تھا۔ جمشید سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی اور صاف و سُریلی آواز میں کہا۔

"خدا اور اُس کا تصور ایک قدیم تخیّل ہے۔ جمشید تم اس کو نہیں مانتے۔ فرض کرو کہ خدا موجود نہیں لیکن ہم اُس کے وجود کے قائل ہیں تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ لیکن جمشید اگر خدا موجود ہے جیسا کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے صناع کا پتہ دیتا ہے اور تم اس سے منکر ہو تو بتاؤ تمھارا کیا حشر ہوگا؟ خدا کا وجود یا عدم وجود دونوں ظنی چیزیں ہیں اور اگر یقین نہیں تو مصلحتاً ہی تم کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ نفسیاتی طور پر ہر انسان اطمینانِ قلب چاہتا ہے۔ اب ذرا غور سے دیکھو کہ اطمینانِ قلب تم کو حاصل ہے یا ان کروڑوں بندگانِ خدا کو جو خدا اور اس کی امداد پر ایمان رکھتے ہیں۔ تمھارے دماغ کا ہر گوشہ خشک ہو گیا ہے اور اگر تمام عمر حقائق اشیا معلوم کرنے میں صرف کر دو گے تو بھی کچھ معلوم نہ ہوگا۔ پھر دانستہ زندگی کی مسرّتوں کو کیوں برباد کرتے ہو۔ ہوا کو دیکھو پھولوں کی نازک پنکھڑیوں سے چھو کر ان کی مہک کو تمھارے پاس پہونچا رہی ہے۔ آسمان کے ستارے تمھاری طرف جھکے جاتے ہیں اور ہلکی ہلکی روشنی پہونچا رہے ہیں، زمین تمھارے بوجھ کو اپنے سینے پر اٹھائے ہوئے ہے۔ کائنات کا یہ نظام اور ارتباط محض محبت پر قائم ہے اگر تم کو اپنے نظریوں سے محبت نہ ہو تو تحقیق و انکشاف کا دروازہ بند ہو جائے۔ حقیقتِ اشیاء معلوم کرنے کا ذوق تمھیں کس قدر محبوب ہے لیکن محبت کو سب سے بڑی لعنت سے تعبیر کرتے ہو خدا جانے تمھارا توازنِ دماغی قائم ہے یا نہیں۔ میں فطرت کا کھلونا ہوں؟ تم اس سے کمینہ نہیں جانتے۔ جمشید تم نامہربان ہی نہیں غیر مہذب بھی ہو۔ میں نے کب تمھیں اپنی محبت کی دعوت دی ہے

تم پر ترس کھاتی ہوں، خدا تم پر مہربان ہے اُس نے تم کو حسین بنایا ہے۔ لیکن وہ جلد اپنے عطیہ کو واپس کرلے گا۔ چند برس تم اپنی زندگی مکمل طریق پر بسر کرسکو گے۔ شباب کے ساتھ تمھارا حُسن اور اس کے ساتھ تمھاری فتحمندیاں بھی ختم ہوجائیں گی۔ ہر نیا دن تم کو ایک ہیبتناک انجام سے قریب کررہا ہے وقت تمھارا رقیب ہے اور تمھارے گلابی رخساروں اور شباب میں چُور جسم کے ساتھ متواتر جنگ کررہا ہے۔ کیا اُس وقت کا تصوّر کرسکتے ہو جب تمھارے گالوں پر جھرّیاں پڑجائیں گی۔ آنکھوں کی روشنی رفتہ رفتہ زائل ہوتی چلی جائے گی۔ بغیر سہارے بیٹھکر اُٹھ بھی نہ سکو گے۔ پھول کی نازک پنکھڑی مرجھا کر گرجاتی ہے۔ لیکن پھر اسی زمین سے دوبارہ پیدا ہوجاتی ہے۔ تمھارا شباب جب جاتا رہے گا تو اُس کی واپسی ناممکن ہے۔ شباب حیرت ناک لذتوں سے بھرا ہوا ہے۔ زندگی آج ہے اس کو رائیگاں نہ جانے دو۔ اِس زمین و آسمان کے درمیان تمھارے خشک اور فرسودہ فلسفہ کے علاوہ اور دلچسپ چیزیں بھی موجود ہیں"

برجیس اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ وہ تھک گئی تھی۔ لیکن ہیجانی کیفیت اِس پر طاری تھی۔ کنکھیوں سے جمشید کے چہرے کا رنگ دیکھ لیتی تھی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد جمشید نے مہر سکوت توڑی۔ چند قدم آگے بڑھ کر برجیس کے بالکل قریب کھڑا ہوگیا۔ زبان سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جذبات کا سیلاب الفاظ کا ایک جملہ بھی مرتب نہ ہونے دیتا تھا۔ بالآخر ایک معنی خیز لہجہ میں کہا "برجیس! برجیس!! یہ ظلم ہے۔ صنفی قوت کا ناجائز استعمال ہے تم جذبات سے اپیل کررہی ہو"

برجیس نے ہلاکت آفریں تبسم کے ساتھ کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ جمشید صنفی قوت کا اعتراف کرے" برجیس کی فطری شوخی عود کر آئی تھی اور اب وہ ہر پہلو سے جمشید کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کا تہیہ کرچکی تھی سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "جمشید! فلسفہ کے مالیخولیا نے تم کو بے وقوف بنادیا ہے۔ چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے کی فکر میں ہمہ وقت اپنا دماغ خراب کرتے رہتے ہو۔ لیکن روزانہ کی عملی زندگی میں تمھارا علم ابھی ابجد سے بھی آشنا نہیں۔ میں صرف دوستانہ تعلقات کی وجہ سے تمھارے پاس آئی ہوں تم نے اسے عورت کی کمزوری پر محمول کیا اور چونکہ آسانی سے تم مجھ سے بات چیت کرسکتے ہو۔ اس لئے بعض اوقات میری توہین کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ یاد رکھو

آج کے بعد برجیس اور تم دونا آشنا شخصیتیں ہوں گی۔ تم اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کرو۔ برجیس آئندہ تمھارے ذوق و شوق اور تحقیقاتِ علمی میں مخل نہ ہوگی۔"

یہ برجیس کا آخری لیکن تیز حربہ تھا۔ عورت کے ترکش میں ایسے صدہا تیر ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جمشید بالکل مبہوت تھا۔ برجیس کا ہر لفظ کیوپڈ کی بے پناہ کمان سے تیر پر تیر برسا رہا تھا۔ مقصدِ حیات کی تمام راہیں چشم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ فلسفہ بھاپ کی طرح دماغ سے اُڑ گیا۔ برجیس حسن کی دیوی بنی ہوئی جمشید کے سامنے کھڑی تھی وہی آج اس کا مقصدِ حیات تھی اور اس کی پرستش جمشید کے فلسفہ کا نچوڑ۔ اس منکرِ خدا کی قلبِ ماہیت قابل دید تھی۔ خدائے حقیقی پر ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو لیکن جمشید اس حسن کی دیوی کا پرستار ضرور بن گیا تھا۔

"جمشید! کیا ہوا؟ کیا تمھاری تمام کائنات ایک ضعیف عورت کے ناپائدار حسن نے پلٹ کر رکھ دی۔ کچھ بتا سکتے ہو کہ اب کس منزل میں ہو؟" برجیس نے دریافت کیا۔

"برجیس! عورت کی قوت کا قائل ہوں میں اُس منزل میں ہوں جہاں نسل انسانی نے اصنام پرستی شروع کی تھی۔ یہ انسانیت کا ابتدائی دور تھا اور یہی میری زندگی کا آغاز ہے" جمشید نے کہا۔

"جمشید! میں تم سے محبت کرتی ہوں یہ عورت کی قوت نہیں ہے یہ شباب کا اٹل قانون ہے۔ نپولین نے بڑے بڑے تاجداروں کے سروں کو اپنے پیروں میں روند ڈالا لیکن حسن اور شباب کے مقابلے میں اکثر شکستیں اٹھانی پڑیں۔"

برجیس مسکرا رہی تھی۔ جمشید آگے بڑھا اور برجیس کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر آخری نذرِ عبودیت پیش کر دی .... یہ شباب کی فتح تھی۔

جمشید اور برجیس ایک کمرے میں بیٹھے ہیں ان کا آخری سلسلہ گفتگو اس طرح جاری تھا

جمشید "برجیس تم ہی مقصدِ حیات ہو۔ تمھاری ذات نے محبت کی حقیقت مجھ پر روشن کی ہے میں تم کو پوجتا ہوں۔"

برجیس "مرد بہت خوشامدی اور چاپلوس ہوتا ہے۔"

جمشید "عورت بڑی خوشامد پسند اور جادوگر ہوتی ہے۔" ع عشق ازیں بسیار کردست و کند

مفلس امیر زادہ

(بہ سلسلہ ماسبق "پیمانہ" ماہ جولائی ۱۹۳۷ء)

از سید محمد یحییٰ صاحب بہٹی

کرسٹی! جیرالڈ نے کہا "میں عنقریب کناڈا جانے والا ہوں۔ انگلستان میں کوئی ملازمت مجھے ابتک دستیاب نہیں ہوئی۔ روانگی سے قبل میں ایک مرتبہ اپنے اس کھوئے ہوئے آبائی محل کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس طرف چلا آیا۔

"میں ہر وقت آپ کو خوش آمدید کہوں گا" بوڑھے ملازم نے جواب دیا لیکن کسی مزید گفتگو سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ کے خورد نوش کا انتظام کروں۔ میں کمرے میں آگ روشن کرتا ہوں آپ ہال میں تشریف رکھیں تھوڑی دیر میں کھانا بھی حاضر کردوں گا۔"

جیرالڈ اس تواضع کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن کرسٹی کی آنکھوں میں پختہ عزم کو دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ کرسٹی واپس گیا اور اپنی بیوی کو جیرالڈ کی آمد سے مطلع کیا۔ یہ نیک دل عورت بھی جیرالڈ سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنا اس کا شوہر۔ فوراً اٹھی اور ایک گھنٹے کے اندر کھانا تیار کردیا۔

"بہترین کھانا تیار کیا جائے" کرسٹی نے اپنی بیوی کو مخاطب کرکے کہا۔ "اگر نیا مالک اعتراض کرے گا تو میں اپنی جیب سے اس کھانے کی قیمت ادا کردوں گا۔"

"ماسٹر جان (جیرالڈ) تمام مکان میں گھوم رہا ہے۔ میں نے ابھی اس کی آواز سنی تھی۔ شاید اپنی ماں کے کمرے میں اس کی تصویر سے باتیں کر رہا تھا" یہ کہا اور اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ پھر ٹھنڈی سانس کھینچکر اپنے شوہر سے کہا "کاش کہ پرانا زمانہ واپس آجاتا۔"

کھانا تیار تھا۔ کرسٹی نے پرانے دستور اور آداب کے موافق کھانا چنا۔ امراء انگلستان کے گھرانوں میں ملازمین خاص سلیقہ اور شعور کو ملحوظ رکھتے تھے اور اس وقت بھی کرسٹی یہی سمجھ رہا تھا

کہ وہ اپنے آقا کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ جیرالڈ اندوہناک مسکراہٹ سے کچھ سوالات کرتا تھا اور کرسٹی بڑی گرمجوشی سے ان کا جواب دیتا تھا۔ یکایک سامنے والے دروازے پر گھنٹی بجی کرسٹی کا چہرہ فق ہوگیا۔ اور عرصہ تک وہ بُت بنا کھڑا رہا اس غیر متوقع آمد نے جیرالڈ کو بھی متوحش کردیا لیکن بہت جلد اپنے حواس درست کرکے اس نے کرسٹی سے کہا کہ "باہر جاؤ اور دیکھو کون ہے شاید کوئی مسافر راستہ بھول کر اس طرف چلا آیا ہے"

خادم باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک جیرالڈ انتظار کرتا رہا اور پھر اپنے خیال میں مستغرق ہوگیا جیرالڈ کو اپنے پُرانے آبائی مکان سے حد درجہ محبت تھی۔ اس کا خاندان پشتہا پشت سے یہاں رہتا چلا آیا تھا۔ زمانہ کی ناموافقت نے اسے مجبور کردیا تھا کہ اس بیش قیمت محل کو فروخت کردے ایک کمرے میں وہ کُرسی پڑی ہوئی تھی جس پر اس کی ماں بیٹھا کرتی تھی جیرالڈ بغور اس کُرسی کو دیکھ رہا تھا تخیل کی آنکھوں نے پائن کو اس کُرسی پر لا بٹھایا اور اس کو معلوم ہونے لگا کہ پائن ٹکٹکی باندھے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لیڈی ایلن کی ضیافت میں پائن سے اس کی آخری ملاقات ہوچکی اور اب شاید زندگی بھر اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوگا

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک تنومند آدمی جس کے سر پر مشکل سے چند بال باقی رہ گئے تھے اندر داخل ہوا "اس تمام ہنگامہ کا کیا مطلب ہے" آنے والے نے کرخت آواز میں دریافت کیا۔ اس کے پیچھے کرسٹی خوف زدہ کھڑا تھا اس کی طرف مُڑ کر اس شخص نے اس سوال کو دہرایا اور غضبناک لہجہ میں ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ انتہا ہے! میری عدم موجودگی میں تم میرے کھانوں اور میری شرابوں کو اپنے دوستوں کی ضیافت پر برباد کرتے ہو۔ تم جیسے ملازموں کو ملازمت میں رکھنے کا یہی انجام ہوتا ہے ڈلویل خاندان (جیرالڈ کا خاندان) کو دھوکا دینے میں تم کامیاب ہوگئے۔ لیکن مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ تم اور تمھارا دوست دونوں چور ہیں۔

بوڑھے ملازم کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہوگیا۔ وہ اپنی توہین برداشت کرسکتا تھا لیکن پُرانے آقا کی تذلیل اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ آگے بڑھا اور سخت لہجہ میں کہا۔ "آپ بغیر سوچے سمجھے گفتگو فرما رہے ہیں" اُس شخص نے کہا "آج تم اپنا بوریا بستر

لے کر اس مکان سے نکل جاؤ" اس کی آنکھیں کھانے کی میز پر جمی ہوئی تھیں اور بار بار اصراف کا خیال اس کو غضبناک بنا رہا تھا۔ جیرالڈ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑی متانت کے ساتھ اس طرح گویا ہوا۔

جیرالڈ ایک شریف النسب امیرزادہ تھا اور "ہالم میز" کی عالیشان عمارت اس کا آبائی مکان تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے جیرالڈ اس مکان کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے خاندانی وکیل نے "ولیم مینارڈ (پالن کا باپ) کے ہاتھ بیچ دیا۔ لیکن نہ جیرالڈ کو یہ معلوم تھا کہ مکان کس شخص کے ہاتھ بیچا گیا اور نہ ولیم مینارڈ جانتا تھا کہ مکان کا پہلا مالک کون تھا۔ جیرالڈ کناڈا کا سفر اختیار کرنے سے پہلے چھپ کر آخری بار اپنے آبائی مسکن کو دیکھنے آیا تھا۔ یکایک خلاف توقع ولیم مینارڈ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ قارئین کی سہولت کی غرض سے ہم چند لفظوں میں گزشتہ منظر کا اعادہ کرتے ہیں

جیرالڈ کھانا کھا رہا تھا۔ یکایک ولیم مینارڈ آ گیا۔ جیرالڈ کو یہاں دیکھ کر وہ بہت برہم ہوا اور پرانے ملازم کرسٹی کو سخت سست کہنے لگا۔ اس کو خیال ہوا کہ کرسٹی اپنے دوستوں کی دعوت اس کی عدم موجودگی میں کرتا ہے اور سامانِ خورونوش کو برباد کرتا ہے اس لئے اس نے غصہ کی حالت میں حکم دیا کہ جیرالڈ اور کرسٹی دونوں فوراً مکان سے نکل جائیں۔

"آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہالم میز" کے نئے مالک آپ ہی ہیں۔ میری موجودگی پر جس قدر بھی اعتراض فرمائیں وہ بجا و درست ہے اور میں مؤدبانہ اس کی معافی چاہتا ہوں لیکن میرے دوست کرسٹی نے تمام عمر کبھی خیانت نہیں کی، جو کچھ اس نے کیا میری خاطر سے کیا۔ قصور سراسر میرا ہی اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس کو ملازمت سے برطرف نہ کریں گے۔"

جیرالڈ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو پہچان لیا جائے۔ اس نے اشارے سے کرسٹی کو بھی منع کر دیا تھا کہ اس کا نام زبان پر نہ لائے۔ اسی وجہ سے کرسٹی خاموشی سے اپنے پُرانے آقا کی شان میں نا ملائم الفاظ سُنتا رہا۔

"تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ، سُنتے ہو" نئے مالک مکان نے کہا۔ یہ شخص ولیم مینارڈ جوہری، پالن کا باپ تھا۔ پالن دروازے کے قریب اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا کر کہا۔

"مسٹر جیرالڈ!" اس کی آواز نہیں نکلتی تھی، بڑی کوشش سے کہا "آپ سے

اس طرح یکایک ملاقات کا ہونا بہت خوشگوار ہے۔" جیرالڈ سے اس نے مصافحہ کیا اور پھر اپنے باپ کی طرف مڑ کر کہا "ابّا جان! میں آپ کا تعارف مسٹر جیرالڈ سے کراتی ہوں یہ لیڈی آئن کے رشتہ دار ہیں اور ...... اور ......" پالن کی آواز میں لکنت پیدا ہو گئی۔ پھر اپنے کو سنبھال کر کہا "اور میرے دوست ہیں"

"شاید مجھے یہ فخر حاصل ہے"۔ جیرالڈ نے جواباً کہا۔

پالن کے دل میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ لیکن چونکہ جیرالڈ کی طرف سے اعتراف محبت کی کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی اس لئے اس کی فطری حیا رقیق جذبات کو صرف گوشۂ دل میں پنہاں رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ جیرالڈ بھی اپنے افلاس کی وجہ سے اپنی محبت کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا۔

"جیرالڈ نے معذرت کرتے ہوئے ولیم مینارڈ کو بتا دیا کہ اس مکان کا پہلے مالک وہ خود ہی تھا۔ ولیم نے اس معذرت کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پالن خوش تھی کہ اس کے باپ نے "ہالم مینر" خرید لیا تھا لیکن دل کی گہرائیوں میں قدیم خاندان کے اخراج پر بھی اس کو افسوس تھا۔ جیرالڈ سے اس نے اپنے باپ کا تعارف کرانا چاہا لیکن ولیم مینارڈ کی فطری سنگدلی نے اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی لڑکی اس اجنبی سے ایسی بے تکلفی سے کیوں بات چیت کر رہی ہے۔ بالآخر جیرالڈ نے پست آواز میں پالن سے کہا۔

" اگر آپ کے والد بزرگوار میری جسارت کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تو کم از کم آپ ہی معاف فرما دیجئے"

پالن مسکرائی اور کہا "اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ بالکل قدرتی چیز ہے کہ آپ اپنے آبائی مکان کو دیکھنے چلے آئے۔ جہاں تک کرسٹی کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ ملازمت سے برطرف نہیں کیا جائے گا"

جیرالڈ نے الوداع کہا، پالن کا دل دھڑکنے لگا، لیکن جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اس نے جواب میں کہا "خدا حافظ! ...... آپ جب انگلستان واپس آئیں تو وعدہ کیجئے کہ ہم سے ضرور ملئے گا"۔ جیرالڈ مصافحہ کر رہا تھا اور اسکے ہاتھ کی گرفت سخت ہوتی جاتی تھی۔ پھر کسی خیال سے اپنے کو سنبھال کر اس نے کہا "نوازش کا شکریہ، لیکن شاید میں انگلستان کبھی اپنی زندگی میں واپس نہیں آؤں گا باقی

پریم درپن

تمہارا تصوّر

تمہارا تصوّر مجھے بہت کچھ یاد دلاتا ہے ا
وہ لمحات، جو فانی خوشیوں سے معمور تھے،
وہ دن، جب زندگی کی بہجتیں مجھے گھیرے ہوئے تھیں —— !
اور وہ بھولی بسری راتیں، جب ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے صبح کر دیا کرتے تھے!
وہ باتیں، جنھیں میں سمجھتی تھی کہ کبھی نہ ختم ہونے والی، اور غیر فانی ہیں —— لیکن وہ
درحقیقت اُس آواز سے زیادہ ناپائدار تھیں جو کلیوں کے شگفت کے وقت سُنائی دیتی ہے ——
وہ آج ماضی کے عمیق سکوت میں سو گئی ہیں، اِس طرح کہ اب کبھی دہرائی نہ جا سکیں گی!!
تمہارا تصور ایک پُر تسکین شعر ہے جس کے گنگناتے ہی میری روح وہاں پہونچ جاتی ہے
جہاں صرف تُم ہو —— یا وہ خواب، وہ دلکش اور سہانے خواب، جو عہدِ ماضی میں میری روح نے
دیکھے تھے منتشر پڑے ہیں ——!!
اِس طرح جیسے چند نازک اور حسین پھولوں کی پنکھڑیاں تیز اور سرد ہوا کے جھونکوں سے
بکھر گئی ہوں!!

آنسہ حیا میرٹھی

برسات

(۱)

آج پھر سبزہ خلد آرا ہے
یعنی برسات کارفرما ہے

اوڑھ لی ہے زمیں نے سرتاسر
دلکش اور گہری سبز اک چادر

ہو گئے دشت آج لالہ زار
ہو گئے سبز پوش سب کہسار

باغ میں رنگ کا ہے ہنگامہ
دشت ہیں نزہتوں کا مجموعہ

کلیوں میں مسکرا رہی ہے بہار
پھولوں میں جگمگا رہی ہے بہار

سارے منظر ہیں آج گل پیرا
نور سے بھر گئے ہیں سب دریا

دشت ہیں سجدہ زارِ رنگ و بو
وادیاں جوئبارِ رنگ و بو

احمریں جھاڑیاں گلاب کی ہیں
اخضریں ڈالیاں گلاب کی ہیں

فیض فصلِ بہار جاری ہے
ایک ہمیں لکیر زندگی ہے

آج ہر شئے پہ چھا رہی ہے بہار
مجھ کو لیکن ستا رہی ہے بہار

(۲)

ہر چمن میں بہار کا سیلاب
رشکِ جنت ہے عالمِ اسباب

پتہ پتہ ہے مستِ کیفِ بہار
ذرہ ذرہ ہے مستِ کیفِ بہار

کالی کالی گھٹائیں آتی ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں

ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے
دل پہ بے اختیار پڑتی ہے

نغمۂ کیف زا فضا میں ہے
کوئی بربط لئے گھٹا میں ہے

جھومتے ہیں تمام برگ و بار
ہنس رہے ہیں تمام لالہ زار

بلبلوں کی نوا ہے کیف بدوش
"پی کہاں" کی صدا ہے غارتِ ہوش

چھایا دریا پہ رنگِ شامِ کیف　　اُس کی ہر موج ہے خرامِ کیف
شب کی گہری سیاہی میں ہر سو　　جگمگاتے ہیں سینکڑوں جگنو
یاد اُن کی دلا رہی ہی بہار
آہ مجھ کو ستا رہی ہی بہار

(۳)

پھول ہنستے ہیں رقص میں ہی صبا　　چھائی ہو میرے دل پہ غم کی گھٹا
میرے دل پر الم کی بارش ہے　　یاس کی اور غم کی بارش ہے
عشرتیں آہ! میری دھندلی ہیں　　خلوتیں میرے دل کی سُونی ہیں
اُلجھی ہے تارِ غم میں روح مری　　دب گئی بارِ غم میں روح مری
بھینی بھینی ہوا ہے نکہت ریز　　میرے آنسو مگر ہیں طوفاں خیز
یاد رہ رہ کے اُن کی آتی ہے　　اور دل کو مرے ستاتی ہے
وہ، کہ ہیں عشق کے چمن کی بہار　　ہوں تصوّر میں جن کے میں سرشار
کاش بے اختیار آجائیں　　مثلِ ابرِ بہار آجائیں
آہ! لیکن یہ ہے خیالِ خام　　صبح ہوگی نہ میرے غم کی شام
نغمۂ کیف گا رہی ہے بہار
آہ! مجکو ستا رہی ہے بہار

آنسہ خورشید اقبال حیا میرٹھی

پیامِ بہار

کیا تجھے معلوم نہیں کہ بہار آ گئی؟
بلبل کے محبت بھرے راگ، کیا بہار کا رنگین الہام نہیں ہیں؟
کویل کی دکھیاری لے، کیا بہار کا کافی ثبوت نہیں؟
یہ نمناک سبزہ،
نکھری ہوئی شاخیں،
رنگین پھول،
ندی کی مترنم لہریں، گھٹاؤں کی سیاہ دیویاں،
فضا کے اندھیرے راستوں کو چمکانے والے جگنو۔
کیا یہ سب بہار کے رومان خیز پیامبر نہیں ہیں؟
پھر تجھے کیوں نہیں معلوم کہ بہار آ گئی؟
کیا اس لئے کہ میں تیرے دل کے کنول پر اپنی محبت کا مایوس راگ نہ چھیڑ دوں
اور تیرے دل کی کلی میری محبت کے لئے کھلنے نہ پائے؟؟
جس طرح بند کنول کو بھونروں کی بھیرویں میں ڈوبی ہوئی بھنبھناہٹ جگا دیتی
ہے۔ آہ! تجھے معلوم ہے کہ بہار آ گئی۔
مگر تو نے اپنی پلکیں جھکا لیں، تا کہ میں سمجھ لوں کہ تو سو رہا ہے۔
اور ـــــ تو نے یہ رنگین پیام نہیں سنا!

آنسہ گوہر اقبال حور

تیری محبت

(اثر:- بلقیس جمال صاحبہ جمال بریلوی)

تجھ کو اپنے نافۂ گیسوئے پیچاں کی قسم — تجھ کو اپنے دوشِ پر زلفِ پریشاں کی قسم
تجھ کو اپنی سرمئی چشمِ غزالیں کی قسم — تجھ کو اپنے جلوۂ بیباک و رنگیں کی قسم
تجھ کو اپنے عارضِ گل ریز و خنداں کی قسم — تجھ کو اپنے گوشۂ چاہِ زنخداں کی قسم
تجھ کو اپنے سرخ ہونٹوں کے تبسم کی قسم — تجھ کو اپنے مست آنکھوں کے ترنم کی قسم
تجھ کو میرے جذبۂ و جوشِ تمنا کی قسم — تجھ کو اپنے عشوۂ و اندازِ رعنا کی قسم
تجھ کو اپنے بیخودانہ پیار ہی کی قسم — تجھ کو اپنی جادواں جادو طرازی کی قسم
تجھ کو اپنے مضطر و شوریدۂ غم کی قسم — تجھ کو اپنے وحشیٔ گیسوئے برہم کی قسم

تجھ کو تیری ہی قسم ہے میرا حالِ زار سن
داستانِ دردِ تاریخِ دلِ بیمار سن

تیری الفت مرہمِ زخمِ دلِ رنجور تھی — تیری الفت روح و جانِ عاشقِ مجبور تھی
تیری الفت خانۂ تاریک کی تھی روشنی — تیری الفت میرے دل کو برقِ کوہِ طور تھی
تیری الفت کا مغنی تھا ہر اک سازِ نفس — نام لیتی تھی ترا تحریکِ آوازِ نفس
تیری الفت تھی مرے دل کیلئے بوئے شراب — ہر نفس تھا اس کی خوشبو سے محبت کا گلاب
اونگھنے لگتے تھے تارے جب خمارِ خواب سے — تیری الفت جاگ اٹھتی تھی کنارِ خواب سے
سینکڑوں کلیاں چٹکتی تھیں نمو کے جوش میں — تیری الفت پھول بنتی تھی مرے آغوش میں
سبزہ مست انگڑائیاں لیتا تھا جب برسات میں — تیری الفت مسکراتی تھی مرے جذبات میں

چاندنی راتوں کے کیف آگیں تجلیات میں　　تیری الفت برق تھی غم خانۂ جذبات میں

الغرض تیری محبت تھی سراسر حیات
کائنات الفت تھی مجکو تیری الفت کائنات

نجمِ سحر

ڈوب جا میرے قسمت کے تارے کی طرح ڈوب جا، اے صبح کے اُداس اور زرد نجم سحر! تجھے اپنی پیلی پیلی سرسوں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی کرنوں کی قسم مجھے بھی اپنے ساتھ عدم کے سمندر میں ڈبو دے۔ اپنی تمام کائنات محرومی کے ساتھ ڈبو دے **بچے**! یہ دنیا کی امیدیں غفلت کی نیند سو رہے ہیں **نوجوان**، یہ مستقبل کی دنیا کے کھویا الھڑ نیند میں غافل ہیں۔ ان کے دل صبح شباب ہوتے ہی کنول کی کلیوں کی طرح شگفتہ ہو جائیں گے **بوڑھے**! یہ آغاز و انجام کی خوفناک تصویریں، موت کے منتظر پڑے ہیں۔ کوئی سو رہا ہے کوئی غافل ہے کوئی موت کی طرح سرد پڑا ہے۔ مگر میں تیرے ساتھ ساری رات جاگتی رہی ہوں، میں مخلوقات میں سب سے الگ ہوں، مجھے سب کی نگاہوں سے بچا کر عدم کے سمندر میں ڈبو دے، میں نہ سونا چاہتی ہوں نہ غافل ہونا چاہتی ہوں نہ سرد پڑنا چاہتی ہوں، میں ڈوبنا چاہتی ہوں ناکامی اور المناکی نے میری روح کو، میرے دل کو، میرے احساس کو، میری ساری کائنات کو، نراش کر دیا ہے نراش، اے امید کی چھوٹی نشانی ڈوب جا اور مجھے بھی ڈبو دے۔

دنیا جس کے غافل پیکر کو تو تکتا رہا ہے رات بھر گھورتا رہا ہے عبرت و حیرت سے جائزہ لیتا رہا ہے۔ میرے اور تیرے ڈوبنے کا احساس بھی نہ کرے گی۔ اس بھلاوے میں مت رہ کہ کل کی شام کو تو پھر چمکیگا۔ آج کا ڈوبنا عمر بھر کا ڈوبنا ہے۔ دنیا صبح ہوتے ہی نئے تاروں کی جستجو میں گم ہو جائے گی اور سورج کو دیکھ دیکھ کر جیے گی۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ڈوب جا اور ڈبو دے

سعیدہ

بادۂ الہام

شعرائے عصر کے افکار

حضرت جگر مرادآبادی مدظلہ

(بطور خاص پیمانہ کے لئے)

رنگ و بو کی دنیا میں اب کہاں جواب اُن کا
عشق فرش بزم اُن کا حسن فرش خواب اُن کا

اوج پر جمال اُن کا جوش پر شباب اُن کا
عہد ماہتاب اُن کا دورِ آفتاب اُن کا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہی عالم تُرآب اُن کا

کہیے حال دل لیکن دیکھیے کن آنکھوں سے
ہر سکوں کے پردے میں حشر اضطراب اُن کا

یونہی کھولے جاتے ہیں حسن و عشق کے اسرار
اک نفس سوال اپنا اک نفس جواب اُن کا

اور کس کی یہ طاقت اور کس کی یہ جرأت!
عشق آپ آڑ اپنی حسن خود حجاب اُن کا

رنگ و بو کے پردے میں کون پھوٹ نکلا ہے
چھپ سکا چھپانے سے کیا کہیں شباب اُن کا

جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے
نیم واسی آنکھوں میں اُف وہ کیفِ خواب اُن کا

عرضِ غم نہ کر اے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اونہہ" کہہ کر سن لیا جواب اُن کا

تو جگر سے مستوں پر طعن کرنہ اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اُن کا

حضرت ماہر القادری

دیکھنا! یہ کون بے پردہ نمایاں ہو گیا
ایک عالم بے نیازِ کفر و ایماں ہو گیا

آج اپنے کبر پر زاہد پشیماں ہوگیا
زہد نے اتنی ترقی کی کہ عصیاں ہوگیا

کھُل ہی جاتا ایک دن تیری مسیحائی کا راز
وہ تو یہ کہیے کہ غم کا نام درماں ہوگیا

بحرِ وحدت میں اُٹھی تھی آج اک بیتابی موج
عالمِ کثرت میں جس کا نام انساں ہوگیا

ٹھوکروں ہی ٹھوکروں میں پاگئے منزل کو ہم
مشکلوں ہی مشکلوں میں کام آساں ہوگیا

پھر کوئی نکلا ہی گھر سے لے کے دنیائے شباب
پھر کسی کمبخت کے مٹنے کا ساماں ہوگیا

میں نے ماہر آج کچھ اس دھن میں چھیڑا سازِ عشق
ذرّہ ذرّہ خاکِ ہستی کا غزلخواں ہوگیا

آغا حشر مرحوم کے دو غیر مطبوعہ شعر

آغا حشر مرحوم نے ایک خاص موقع پر یہ شعر ارشاد فرمائے تھے۔

جو خود کہتا ہے ہاں ہاں بیوفا ہوں بے مروّت ہوں
اُسی ظالم سے مجھ کو پھر محبت ہوتی جاتی ہے

غضب ہے بھول کر بھی اب نہیں ملتی نظر تیری
یہ تجھ سے بھی زیادہ بے مروّت ہوتی جاتی ہے

نوّاب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ بی، اے لکھنوی

حشر اور اُس کے بعد کا ساماں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں دل کے داغ فروزاں کئے ہوئے

پھر دل ہے منتظر کسی یوسف جمال کا
آنکھوں کو فرطِ شوق میں زنداں کئے ہوئے

نظارہ ہے امیدِ تبسم میں گل بکف
دل کو فدائے جنبش مژگاں کئے ہوئے

ترکیب سوچتے رہے وہ اہتمام کی
زخمِ جگر پہ سایۂ مژگاں کئے ہوئے

صحرا نہیں ہے کوئی ہمارے مذاق کا
بیٹھے ہیں اپنے گھر کو بیاباں کئے ہوئے

بکنے چلا ہے عشق کے بازار میں وہ شوخ
عصمت کو اپنے حسن کا درباں کئے ہوئے

پہونچے گا تیرے در پہ اثر ایک دن ضرور
آبادیٔ خیال کو ویراں کئے ہوئے

حضرت اظہار میرٹھی

نقاب رُخ پہ نہیں آنکھ میں حجاب نہیں
یہ اور کیا ہے اگر مستیٔ شراب نہیں

سنورئے شوق سے کچھ باعثِ حجاب نہیں
فریب آئینہ ہے آپ کا جواب نہیں

غضب یہ جلووں کا طوفان ای معاذ اللہ
کہ دل کو شوق ہو چشم ہوس کو تاب نہیں

تمھارا دیکھنا اک عسم کا پیش خیمہ تھا
وہ نیند اُچٹی ہو ابتک مجالِ خواب نہیں

فریبِ عشق کی اللہ رے کارفرمائی
وہ غم دئے ہیں کہ جنکا کوئی حساب نہیں

شبِ فراق بجز مرگ اور کیا ہوگا
سکوں نصیب نہیں تابِ اضطراب نہیں

حکیم زیبا صاحب فیض آبادی

یہ جو دل بے قرار ہے پیارے
عشق خود شرمسار ہی پیارے

تو جسے دیکھ لے نظر بھر کر
وہ مجسم بہار ہے پیارے

اک نظر دیکھ لے ترے صدقے
دل بہت بیقرار ہے پیارے

غم جو تو نے عطا کیا اُس پر
ہر مسرت نثار ہے پیارے

دل کی فطرت میں ہے تڑپ اُٹھنا
دل پہ کب اختیار ہے پیارے

حسن پہ اعتماد کیا معنی؟
عشق پر اعتبار ہے پیارے

درد بخشا مجھے عفاک اللہ
درد ہی خوشگوار ہے پیارے

جلوۂ شوق و اہتمامِ نظر
تجھ پہ سب کچھ نثار ہے پیارے

ہر نظر میں ہے کیف و سرمستی
ہر نظر بادہ خوار ہے پیارے

نگہِ آشنا بنا دے اُسے
وہ جو بیگانہ وار ہے پیارے

اس میں تیری خطا نہ دل کا قصور
عشق خود فتنہ کار ہے پیارے

یہ جو دیوانہ سا ہے اک زیبا
تیرا ہی جاں نثار ہے پیارے

حضرت مرزا بیضا خاں مروی ایرانی

جان موردِ اضطراب تا کے
دل درتگ پیچ و تاب تا کے

از موت و حیات و حشر و عقبےٰ
بر گردنِ من عذاب تا کے

اے جائے تو بر سر و بچشم ، از عاشق خود حجاب تا کے
تو بہ نہ کنم ز شاہد و مے ، دائم کا آخر شباب تا کے
بیدار شو اے نصیب خفتہ ، از خواب بہ خیز خواب تا کے
بیضا بہ بلائے غم گرفتار ، یا حضرتِ بو تراب تا کے

حضرت فطرت واسطی بی، اے

جب شام کو حُسنِ صبح کا عالم ایک فسانہ بنتا ہے
جب چاندکی ضو سے زیرِ سما پُر نور خزانہ بنتا ہے

جب شوخ ستارے ہنستے ہیں اور نُور کی بارش ہوتی ہے
جب حُسن کے سارے عالم میں آنکھوں سے پرستش ہوتی ہے

جب عیش کی موجیں ہستی کو جھولے میں جھلانے آتی ہیں
جب نیند کی پریاں دنیا کو چُپکے سے سُلانے آتی ہیں

کچھ نیند سی طاری ہوتی ہے میں کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں
معلوم نہیں اس عالم میں، میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں

احساس میں کچھ مدہوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
انفاس میں کچھ سرگوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے

بجلی سی چمکتی ہوتی ہے، پُر نور نگاہیں ہوتی ہیں
جذبات میں جنبش ہوتی ہے مخمور نگاہیں ہوتی ہیں

تم میری نظر کے دامن میں انگڑائیاں لیکر سوتے ہو
تم سانس کہیں بھی لیتے ہو، محسوس مجھے تم ہوتے ہو

یارانِ میکدہ

کیف حالکا ——— ؟ سُنا ہے کہ ڈاڑھی کے بعد آپنے ماشاء اللہ گیسو بھی چھوڑ دیئے ہیں! لیکن شاید آپ کو اِس سے اتفاق ہوگا کہ صوفیانہ ارتقا کی ایک منزل" ڈسٹرکٹ گزٹ" کی ایڈیٹری کا ترک بھی ہے۔ گستاخی تو ہوگی مگر کیا آپ کی مجذوبانہ بیخودی یہ راہِ سلوک گم کردہ راہوں پر بھی کھول سکتی ہے کہ" ڈاڑھی" اور" گیسو" چھوڑنے کے ساتھ ساتھ آپنے "نوکری" کیوں نہیں چھوڑی ——— !؟!

کیا اِس لئے نہیں چھوڑی کہ" پیری مریدی" کے لئے اِکّا دُکّا سفید بالوں کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے اور ماشاء اللہ ابھی آپ کی ریشِ مبارک پہاڑی کوّے کو مات کر رہی ہے۔
——— جو کچھ بھی ہو مگر آپ کی" جوانمرگی" نے آپ کے شیدائیوں کو سر تا پا" الفاتحہ" بنا دیا ہے۔

یادش بخیر " سرخیلِ رنداں" کی یہ مصیبت بھی کتنی دلچسپ، دیدنی اور قابلِ رحم ہے کہ" بت پرست" کے چنگل سے رہائی ملی تو" بت شکن" کے پنجے میں تھے اور" بت شکن" سے چھوٹے تو اپنے پنجۂ خودکشی میں پھنس گئے! "بامن دیوتا" بزعم خود ترلوک کی ذمہ داری لئے ہوئے تھے اور مُلّا صاحب دوزخ و جنت کی، مگر انقلاب زندہ باد کہ "کلیمی" کی ذمہ داری اب خود اپنی" برق و طور" پر ہے۔

بیک وقت عبودیت و معبودیت، ارنیؔ و لن ترانی کی کشاکش ہے۔
کہاں سرخیلِ رنداں اور کہاں یہ کشاکش، کہئے دی۔پی فارم بھرنے میں دقت تو نہیں ہوتی؟

"یارانِ میکدہ" ہونے کی یہ شرط ہرگز نہیں کہ آپ زندہ رہیں اور لاپتہ، کوئی شک نہیں کہ

جوش "کلیم" کی لپیٹ اور آپ "شعلۂ طور" (؟) کی جھپیٹ میں ہیں ــــــ مگر محض آپ ہی کو نہیں ساغر کو بھی بادۂ شیراز سے کچھ تعلق ہے ــــــ!

واللہ جس دن ہم نے "اَرِنی" کہا وہ تمام حجابات پھونک کر خود نکل آئیں گے۔ اور ہم مسکرا کر آپ کی طرف اشارہ کر دیں گے ــــــ اب تو مین پوری بلا لیجئے!؟

اُس گلچیں کے اثر کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو بمبئی میں بیٹھے بیٹھے دہلی کے چمنستان سے گلاب کو اس طرح توڑے گویا میز پر رکھا ہوا تھا۔ بہت اچھا ہم نے بھی اک "جلالی عمل" شروع کر دیا ہے۔ "ہینگنگ گارڈن" اور آپ کچھ دنوں میں نئی دہلی کی زینت ہوں گے، ورنہ خیریت اسی میں ہے کہ ــــــ!

غزل کے استراد میں جو مضمون کلیم میں شائع ہوا تھا وہ اتنا مسکت و مدلل تھا کہ آپکو نہ صرف فراموش کر گیا بلکہ بیمار بھی ڈال گیا۔ اگر آپ تنہائی میں اعتراف شکست کر لیں تو ہم آپکے اب بھی بتا سکتے ہیں کہ آپ کا "قاتل" آپکے دوستوں ہی میں سے ایک ہے، اور آپکی نگاہوں کے سامنے ہنستا بولتا اور آزاد چلتا پھرتا ہے۔

اور اگر آپ ہم کو، کوئی بڑی رشوت دیں تو "جمالو" کا بھی پتہ دیا جا سکتا ہے ــــــ مگر یہ تو بتا دیجئے کہ آپ اب جامعہ والے اپنے مضمون پر ایمان تو نہیں رکھتے!؟

کچی نیند سے جگا کر آپ کا یہ کہنا کہ غازی آباد تک چلو، اور پھر میرٹھ اسٹیشن سے چپ چاپ گھر واپس آجانا۔ میرٹھ کو غازی آباد بنا دینے کے لئے کافی تھا ــــــ اسی دن سے میرٹھ سٹی اسٹیشن کے در و دیوار پر "غازی آباد" لکھا دیکھا گیا۔ پڑھنے والوں نے کہیں کہیں یہ مصرع بھی پڑھا۔

عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا ــــــ!؟

"س"

فریب شکن اعلان

تمام عوام و خواص کی اطلاع کے لئے میں نہایت ضروری سمجھتا ہوں
کہ "علی گڑھ پرنٹنگ پریس" دہلی کے مالک یا منیجر ضیاء الرحمٰن صاحب کی غلط بیانی کے
متعلق کہ "کتاب بادۂ مشرق" مطبوعہ ساغر پریس میرٹھ، علی گڑھ پرنٹنگ پریس میں طبع
ہوئی ہے، ایک واضح اعلان کر کے پبلک کو یہ بتا دوں کہ علی گڑھ پرنٹنگ پریس دہلی کے مالک
بادۂ مشرق گاہکوں کو دکھا کر کس طرح کام حاصل کرتے ہیں۔

اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ :-

عالیجناب راؤ بہادر حاجی محمد عبد الحمید خاں صاحب منظر رئیس اعظم باغپت نے
ساغر صاحب سے فرمایا کہ علی گڑھ پرنٹنگ پریس والوں نے ان سے یہ کہا کہ بادۂ مشرق ہمارے
پریس میں چھپا ہے، اور اس بنا پر انھوں نے اپنی کتاب "آفتاب رسالت" علی گڑھ پرنٹنگ
پریس میں طبع ہونے کے لئے دیدی۔

لیکن عرض یہ ہے کہ ضیاء الرحمٰن خاں شروانی میرے ہم وطن ہیں اور ان کی یہ حرکت
نازیبا، انتقام کے بجائے رحم کی حقدار ہے۔ اس لئے میں ہر خیال سے درگزر کرتا ہوں اور اعلان
کرتا ہوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ بادۂ مشرق مجموعہ کلام ساغر صاحب [illegible] تک نظم و کمال رجب
[illegible] ساغر پریس میرٹھ میں طبع ہوئی ہے۔

اس لئے ضیاء الرحمٰن خاں [illegible] ہندوستان [illegible] بادۂ مشرق دکھا کر گاہکوں
سے کام حاصل کرنا ایک غلط بیانی، [illegible] جعلسازی کا جرم ہے اور پبلک کو
[illegible] سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

جو صاحب بادۂ مشرق جیسی شاہکار کتاب چھپوانا چاہیں وہ براہ راست ساغر پریس میرٹھ سے خط و کتابت کریں یا خود میرٹھ تشریف لائیں جہاں کتابت کو خود ساغر صاحب کی ڈائرکشن میں مکمل طور پر طبع و تیار ہوئی ہے۔ دعویٰ نہیں لیکن بہ ادب گذارش ہے کہ بادۂ مشرق کی طباعت کے کمال کا ریکارڈ اگر کوئی توڑ سکتا ہے تو یقین فرمائیے کہ اس نیلگوں آسمان کے نیچے صرف ایک پریس ہے اور وہ صرف ساغر پریس میرٹھ۔

خاکسار احمد یار خان (مینجر)

مشتہرین کیلئے بہترین موقع

رسالہ "پیمانہ" سے کوئی شہر اور کوئی قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کے پندرہ بیس خریدار نہ ہوں۔ اگر آپ اپنی تجارت کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو رسالہ "پیمانہ" میں اپنا تجارتی اشتہار دیجئے۔ "پیمانہ" کی اشاعت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی اس کے مستقل خریدار موجود ہیں، اس میں اشتہار دینے کے بعد آپ کو خود حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

نرخ نامہ حسب ذیل ہے

مدت	پورا صفحہ	نصف صفحہ	¼ کالم
ایک سال	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۶ مہینہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۳ مہینہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک بار	[illegible]	[illegible]	۱۲

نوٹ، اشتہار کی اجرت بذریعہ منی آرڈر پیشگی آنی چاہئے، ورنہ اشتہار درج نہ ہوگا۔ مینجر پیمانہ ادبی مرکز میرٹھ

بادۂ کہن

پیمانہ کے گذشتہ منتشر نمبر ایک جلد کی صورت میں

دور اوّل پہلی جلد سائز ۲۶×۲۰/۱۶ مع محصول ڈاک محض ایکروپئیہ

دور ثانی دوسری جلد ۲۷×۱۷/۸ (بادہ مشرق سائز) " محض بارہ آنے ۱۲/

دور ثالث تیسری جلد ۳۰×۲۰/۸ (نگار سائز) " محض ایکروپیہ آٹھ آنے ۱۸/

ہر جلد بادۂ کہن کے نام سے جدید سرورق سے آراستہ کرکے مرتّب کی گئی ہے اور دفتر "پیمانہ" ادبی مرکز میرٹھ سے ملتی ہے، مندرجہ بالا قیمتیں نمبروں کی اصل قیمت سے ۱/۴ مقرر کی گئی ہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ ادب سے ذوق رکھنے والوں تک یہ تحفہ پہونچ جائے اور اس سے جو کچھ حاصل ہو وہ موجودہ پیمانہ پر صرف کردیا جائے اتنی کم قیمت میں ایسی مجلّدات مل جانا ایک حسن اتفاق ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

منیجر

مکتبۂ ساغر "ادبی مرکز" میرٹھ

(جوانی کے موضوع پر اردو شاعری میں سب سے عجیب اور جدید کتاب)

سنہ ۱۹۲۵ء میں "شبابیات" کے عنوان سے ساغر نظامی کی ۴۶ رباعیاں شائع ہوئی تھیں، اب گیارہ برس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن "سرودِ شباب" کے نام سے کافی ترمیم کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ اپنی نئی ترکیب کی بنا پر یہ بجائے خود ایک نئی تصنیف ہے۔ شبابیات میں محض شاعر اپنے شباب کا مغنّی تھا لیکن گیارہ برس میں شعور نے سینکڑوں منزلیں طے کیں اور وہ اس منزل پر آ پہونچا جہاں خود فریبی، خود نگری، خود پرستی، بیخودی اور خودستائی حسن کی مدّاحی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے حصّے میں شاعر اپنی جوانی کے گیت پوری سرمستی سے گاتا ہے اور دوسرے حصہ میں حسن کا نغمہ گر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کتاب "بادۂ مشرق" سائز پر چھاپی گئی ہے اور ہر رباعی کی تصویر پس منظر (Back ground) میں دی گئی ہے اس التزام نے کتاب کو جوانی کا طلسم زار بنا دیا ہے۔ کاغذ نہایت اعلیٰ اور کتابت اعلیٰ ترین ہے۔ چھپائی میں "ساغر پریس" نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ جلد بندی کے بجائے کتاب کو ریشمیں فیتہ سے باندھا گیا ہے ٹائیٹل رنگین، بلاک کا ہے اور آرٹ کا بہترین نمونہ۔ قیمت عہ، علاوہ محصول

پرنٹر و پبلشر اسد یار خان صہبا نے "ساغر پریس" میں چھپوا کر ادبی مرکز میرٹھ سے شائع کیا